ماہنامہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

بسم اللہ الرحمان الرحیم

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہ نامہ

مجلہ

حیات نو

بلریاگنج

جلد: ۱۳ رجب المرجب ۱۴۱۸ھ نومبر ۱۹۹۷ء شمارہ: ۱۱

مدیر مسئول

نور محمد فلاحی

معاون مدیر

انیس احمد فلاحی

بدل اشتراک

☆ سالانہ زرتعاون	: ۵۰/- روپئے	☆ طلبہ کے لیے	: ۳۰/- روپئے
☆ خصوصی زرتعاون	: ۱۰۰/- روپئے	☆ اعزازی زرتعاون	: ۱۰۰۰/- روپئے
☆ بیرون ملک سے	: ۲۵/ امریکی ڈالر	☆ قیمت فی شمارہ	: ۵/ روپئے

○ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے لہذا جلد سالانہ زرتعاون ارسال فرمائیں۔

مضمون نگار کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہ نامہ "حیات نو" جامعۃ الفلاح بلریاگنج
اعظم گڑھ یوپی ۲۷۶۱۲۱ - فون نمبر ۲۵۱۱۵

کتابت: محمد اشتیاق عالم فلاحی "جامعۃ الفلاح"

نقوش حیات نو

اداریہ

علم کے ضرر رساں ہونے کی چند صورتیں — انیس احمد فلاحی

درس قرآن

انفاق کی ضرورت واہمیت — حافظ احسان الحق فلاحی

مقالات

علامہ زمخشری اور ان کی تفسیر "الکشاف" — نظام الدین اصلاحی

تفسیر سورہ اخلاص از علامہ فراہی ۔ ایک مطالعہ — ملک وسیم احمد فلاحی

پردہ پر بعض اعتراضات کا جائزہ — محمد رضی الاسلام ندوی

مذاہب عالم

یہودیت — انیس احمد فلاحی

تحریکات عالم

نصیریت — اشتیاق الحسن مظہری

تاثرات واحساسات

علامہ محمود شاکر کا سانحہ ارتحال — عبدالکریم انور تیمی

آہ سید یوسف مرحوم — رحمت اللہ اثری فلاحی

جامعہ کے لیل ونہار

جامعۃ الفلاح سوگوار ہے — ادارہ

طلبہ کا تعلیمی مظاہرہ

تقسیم انعامات

حکیم عبدالرحمٰن صاحب کا انتقال

اداریہ

علم کے ضرر رساں ہونے کی چند صورتیں

علم کی اہمیت وفضیلت عیاں راچہ بیاں کے مصداق ہے۔ ایمان اور اعمال عالم کا سرچشمہ، رشد و ہدایت کا منبع، خشیت الٰہی کا ذریعہ اور ہر طرح کی خیر و بھلائی کا منشا و مولد علم ہی ہے۔ جس طرح ہر قیمتی شیئ کو کوئی نہ کوئی مہلک روگ لگ کر اس کے حسن و قیمت کو متاثر کردیتا ہے اسی طرح علم کو بھی چند مہلک روگ لگ کر اس کی افادیت واہمیت کو گھٹا دیتے ہیں۔ جن میں اہم ترین چیزیں یہ ہیں، عدم اخلاص، بے عملی، حب مال وجاہ اور خود پسندی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے قریب واقع ہونے والی نشانیوں میں "اعجاب کل ذی رای برایہ" (ترمذی کتاب التفسیر)۔ (ہر رائے والے کا اپنی رائے پر اترانا اور خوش ہونے) کا بھی ذکر کیا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کے لئے خود پسندی کو انتہائی مہلک شیئ شمار کیا ہے (جامع بیان العلم وفضلہ)۔ علی بن ثابت نے اس مہلک روگ کو اپنے اس شعر میں بڑی خوبصورتی سے پرو دیا ہے۔

المال آفتہ التبذیر والنہب — والعلم آفتہ الاعجاب والغضب

جس طرح اسراف اور لوٹ پاٹ مال و دولت کے لئے تباہی ہے اسی طرح خود پسندی یا ناز و غضب علم کے لئے تباہ کن ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر کسی عالم کو یہ روگ لگ جائے تو وہ ساری عمر معاشرہ کے لئے ایک پیچیدہ مسئلہ بنا رہتا ہے کیونکہ وہ دوسروں سے تو احترام کا طالب ہوتا ہے مگر خود دوسروں کا احترام نہیں کرتا۔

اپنے آپ کو تو حکیم و دانشور سمجھتا ہے مگر دوسروں کو احمق و بیوقوف شمار کرتا ہے۔ اپنی ہر بات سنوانا چاہتا ہے مگر خود دوسروں کی کوئی بات نہیں سنتا اپنی ہر رائے پھیلانا اور سنانا چاہتا ہے لیکن دوسروں کی رائے کو نہیں سننے دیتا ہے۔ دنیا اس کی رائے کو مانے تو تو خوش رہتا ہے۔ کوئی اس کی رائے پر تنقید کر دے تو وہ غضب ناک ہو جاتا ہے۔ دانشوروں کا یہ مقولہ ایسے شخص پر مکمل طور سے صادق آتا ہے کہ: "من اعجب برائیہ ضاع"

علماء کرام اور طالبان علوم شریعت کو ہمیشہ یہ جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ کہیں یہ مہلک روگ انکے اندر سرایت تو نہیں کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہر شخص کو اس مہلک روگ سے بچائے آمین۔

بقیہ: آہ سید یوسف مرحوم

قائم کرنے کی بات تھی، جماعت سے درخواست کی گئی تھی، سید مرحوم نے پیش کش کی کہ ایک کمرہ میرے خرچ پر بنے گا اور اللہ کا نام لیکر کام شروع کر دیں۔ میں نے شکریہ ادا کیا، اور ان کی اس پیش کش پر غور ہوتا رہا، جب تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بلا لیا اور ہم لوگ صرف سوچتے رہے، وہ اللہ کا بندہ اپنا فرض ادا کر کے اپنے رب سے جا ملا۔ اللہ مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا، مسلسل، رواں دواں ہمہ آن مشغول جسمانی آرام ذہنی سکون سے آزاد، مسلم مسائل کا بے باک ترجمان، ملکی مسائل کا بے لاگ تبصرہ نگار اب ہم میں نہ رہا، اللہ ان مساعی کو قبول فرمائے جزائے خیر سے نوازے جنت الفردوس میں جگہ دے، نعم البدل عطا کرے ان کی اولاد کو ان کا ہر معنی میں جانشین بنائے آمین۔

۲۱-۱۰-۹۷

رحمت اللہ اثری فلاحی
(صدر انجمن طلبہ قدیم)

انفاق کی ضرورت واہمیت

حافظ احسان الحق فلاحی

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (سورۃ البقرۃ: آیت ۲۵۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو تمہیں پاک رزق میں سے جو کچھ دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرو اس دن کے آنے سے پہلے جس دن نہ تو دوستی کام آئے گی نہ خرید و فروخت اور نہ ہی شفاعت، اور کافرانہ روش اختیار کرنے والے ہی اصل ظالم ہیں۔

یہ سورۃ البقرہ کی دو سو چونویں آیت ہے جس میں منافقین اور ضعیف الایمان مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری کے لئے مال خرچ کرنے پر ابھارا جا رہا ہے اس سے پہلے اس سورہ کی متعدد آیات میں انفاق کی تلقین کی گئی تھی لیکن مخلص اور معیاری مسلمانوں کے علاوہ بقیہ مدعیان اسلام اس سے گریز کیا کرتے رہے جس کی بنا پر اس آیت میں نہایت تہدید آمیز انداز اختیار کیا گیا ہے۔

انفاق، نفق سے نکلا ہے جس کے معنی سرنگ کے ہوتے ہیں، چونکہ پرانے زمانے میں سرنگیں حفاظت اور دفاع کا نہایت موثر ذریعہ ثابت ہوا کرتی تھیں لوگ جب دشمنوں کا خوف محسوس کرتے تھے تو سرنگوں میں پناہ گزیں ہو کر اپنا بچاؤ کرتے تھے اسی مناسبت سے انفاق کے معنی خرچ کرنے کے ہونے لگا، اس کے ذریعہ شیطانی حملوں، دنیوی اور اخروی پریشانیوں اور خطروں سے اپنے آپ کو بچایا جا سکتا ہے۔

اس آیت میں انفاق کا حکم دیتے ہوئے قیامت کی ہولناکیوں کا نقشہ بھی سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ وہاں خرید و فروخت، دوستی اور شفاعت کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی وہاں صرف انسان ہوگا اور اس کا عمل اس کے علاوہ بخشش اور نجات کا کوئی اور ذریعہ نہیں

ہوگا۔ یہ بات درحقیقت منافقین اور ایمانی کمزوریوں کے شکار نام نہاد مسلمانوں سے کہی جا رہی ہے کیونکہ اس طرح کے لوگ آخرت کے تعلق سے بالخصوص شفاعت سے متعلق بہت ہی غلط تصورات رکھتے ہیں اور یہی غلط تصورات انھیں نفاق اور بےعملی کے راستے پر ڈال دیتے ہیں۔ شفاعت کے تعلق سے تفصیلی بحث ان شاء اللہ آئندہ کسی موقعہ پر پیش کی جائیگی۔

آیت کے شروع میں خطاب کا انداز یوں ہے "اے لوگوں جو ایمان لائے ہو" اور آیت کا اختتام اسطرح ہو رہا ہے "اور کافرانہ روش اختیار کرنے والے ہی پکے ظالم ہیں" جس سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ ایمان لانے کے بعد دینی ضرورتوں اور تقاضوں پر خاص طور سے جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری میں انفاق نہ کرنا سراسر کفر ہے اور کوئی بعید نہیں کہ اس طرح کے لوگ فتوے کی رو سے مسلمان بنے پھرتے رہیں لیکن اللہ کی عدالت میں کافر قرار دیئے جائیں۔ یہاں اس طرح کے لوگوں کو ظالم قرار دیئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی اس روش سے اللہ کے عذاب کو دعوت دے کر اپنے اوپر بہت بڑا ظلم کر رہے ہیں اور ان کے اوپر جو عذاب الیم آئے گا وہ خدا کی طرف سے کسی زیادتی کا نتیجہ نہیں ہوگا بلکہ اس کے ذمے دار یہ خود ہوں گے۔

انفاق خواہ جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری کے لئے ہو یا دوسری دینی ضروریات کی خاطر ہو یا غریبوں اور ناداروں کی امداد کے لئے ہو کسی مخلص مومن ہونے کے لئے بہت بڑی کسوٹی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے۔ "الصدقۃ برہان" (مشکوٰۃ) یعنی صدقہ کسی کے مومن ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔ قرآن و حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انفاق، استقامت اور ثبات قدمی بھی عطا کرتا ہے اور سیرت و کردار کو نکھارتا بھی ہے چنانچہ سورہ بقرہ میں فرمایا گیا ہے: اور جو لوگ اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے اور اپنے آپ

کو ثابت قدم رکھنے کے لئے ان کے صدقات کا حال اس طرح ہے کہ کسی اونچی زمین پر ایک باغ ہو جہاں زوردار بارش ہوئی ہو جس کے نتیجے میں باغ کی پیداوار دوگنی ہو جائے اور زوردار بارش نہ ہو سکے تو ہلکی بوندیں ہی کافی ہوں اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ (آیت رقم ۲۶۵)

سورہ واللیل میں ہے "وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى" (۱۷-۱۸)

اور یقیناً جہنم سے دور رکھا جائے گا وہ انتہائی پرہیزگار انسان جو اپنا مال دیتا ہے تاکہ وہ پاک صاف ہو جائے۔

یہ دونوں آیتیں اس حقیقت پر دلالت کر رہی ہیں کہ انفاق ایک طرف حق پر ثابت قدمی عطا کرتا ہے تو دوسری طرف رذائل سے پاک کر کے اعلیٰ سیرت و کردار کا مالک بناتا ہے۔ اسی طرح حضرت صدیق اکبرؓ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ:

"جہنم کی آگ سے بچو خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعے کیونکہ یہ چیز کجی کو درست کرتی ہے اور بری اور حادثاتی موت سے بچاتی ہے۔ نیز ایک بھوکے کو آسودگی بخشتی ہے (ترغیب و ترہیب)

اس حدیث میں سیرت و کردار کی درستگی کے ساتھ انفاق کا ایک فائدہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس کی بدولت اللہ تعالیٰ حادثاتی موت سے محفوظ رکھتا ہے ایسا شخص انتہائی قابل رشک انسان ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دولت کی فراوانی کے ساتھ ساتھ انفاق کی توفیق بھی دی ہو۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قابل رشک صرف دو ہی طرح کے انسان ہیں ایک وہ انسان جسے اللہ نے مال و دولت سے نوازا ہو اور اسے حق کے راستے میں خرچ کرنے کی توفیق بھی بخشی ہو اور دوسرا وہ انسان جسے اللہ نے حکمت یعنی قرآن کا فہم عطا کیا اور وہ اس کے مطابق فیصلے کرے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دے۔

یہ انسان کی کتنی بڑی نادانی ہے کہ بال بچوں کے سلسلے میں وہ مستقبل کے موہوم اندیشوں کی بنا پر انفاق سے جی چرانے لگتا ہے اور اللہ پر سے اپنا اعتماد اٹھا لیتا ہے اس سلسلے میں ایک بہت ہی خوفناک اور دل کو دہلا دینے والی حدیث پیش خدمت ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن دو ایسے بندوں کو اٹھائے گا جنہیں بہت زیادہ مال و اولاد سے نوازا تھا ان میں سے ایک کو پہلے اپنی نعمتیں یاد دلائے گا پھر پوچھے گا کہ ان نعمتوں کو پا کر تو نے کیا کیا وہ کہے گا کہ میں نے ساری دولت اپنے بچوں ہی کے لئے چھوڑ دی کیونکہ مجھے اندیشہ تھا کہ میرے پیچھے میرے بعد کہیں فقر و فاقہ سے دوچار نہ ہو جائیں اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ اگر تجھے حقیقت کا علم ہوتا تو ہنستا کم اور روتا زیادہ، تیرے بعد میں تیرے بچوں پر وہ آفت نازل کر دی جس کا تو نے اندیشہ کیا تھا۔ پھر دوسرے بندے سے اپنی نعمتیں یاد دلا کر یہی سوال کرے گا۔ وہ جواب دے گا کہ میں نے نیکی اور خیر کے راستے میں تیری بخشی ہوئی دولت کو خرچ کیا اور اپنی اولاد کے سلسلے میں تجھ پر بھروسہ کیا ارشاد ہوگا کہ اگر تجھے حقیقت کا علم ہوتا تو روتا کم اور ہنستا زیادہ جس چیز کے تعلق سے تو نے مجھ پر بھروسہ کیا تھا۔ تیرے مرنے کے بعد میں نے وہی چیز تیرے بیٹوں کو عطا کی۔

(ترغیب و ترہیب)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ انفاق کرنے سے مال میں اتنی برکت ہوتی ہے کہ آنے والی نسل بھی اس سے لطف اندوز ہوتی ہے اور بخل سے اس قدر بے برکتی ہے کہ ایک شخص کے مرنے کے بعد اس کے لواحقین فقر و تنگی سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ یہی مضمون ایک دوسری حدیث میں اس طرح بیان ہوا ہے " ما نقصت صدقة من مال " (صحیح مسلم) یعنی صدقہ کرنے سے مال میں کمی نہیں آتی۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص کے انتقال کے بعد اس کی دولت کا وہی حصہ اس کا اپنا ہوگا جسے اس نے اپنی زندگی میں صدقہ و خیرات کر کے آخرت کے بینک میں محفوظ کر دیا

تھا چنانچہ صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ابن آدم کہتا ہے میرا مال، میرا مال، حالانکہ صرف تین پہلوؤں سے اس کا مال اس کے لئے فائدہ مند ہوتا ہے جو کچھ کھا کر ختم کر دیا جسے پہن کر بوسیدہ کر دیا اور جس کو راہ خدا میں دے کر محفوظ کر دیا اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ اسے چھوڑ کر دنیا سے چلا جائے گا ورثہ اس کے مالک بن جائیں گے۔

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ انسان راہ حق میں خرچ کر کے آخرت کے بینک میں محفوظ کر دیتا ہے قیامت کے روز اسے اس کا سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ ملے گا جیسا کہ آیت ذیل سے واضح ہوتا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (البقرہ-۲۶۱)

جو اللہ کے راستے میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بالی ہو جس سے سات بالیاں اگیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ جسے چاہتا ہے اور بڑھا دیتا ہے اور اللہ وسعت والا اور جاننے والا ہے۔

من تصدق بعدل تمرة من كسب طيب ولا يقبل الله الا الطيب فان الله يقبلها بيمينه ثم يربيها لصاحبها كما يربي احدكم فلوه حتى تكون مثل الجبل (بخاری، مسلم، ترمذی)

جو شخص ایک کھجور کے برابر کوئی چیز اپنی پاک کمائی سے صدقہ کرتا ہے اور اللہ پاک ہی کو قبول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے داہنے ہاتھ میں لیتا ہے پھر صدقہ کرنے والے کے لئے اس کو بڑھاتا ہے جس طرح تم میں کا کوئی شخص اپنے جانور کے بچوں کی پرورش کرتا ہے یہاں تک کہ وہ چیز پہاڑ کے مانند ہو جاتی ہے۔

معلوم ہوا کہ آخرت کے بینک میں دولت جمع کرنے کا نفع دنیا کے بینک سے اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ ہمارے اور آپ کے تصور سے باہر ہے لیکن دل

کے اندھے دنیا کی حقیر متاع کو آخرت پر ترجیح دے کر وہاں کے بے پناہ منافع سے اپنے آپ کو محروم کر دیتے ہیں اس کے برخلاف جن لوگوں کی نگاہیں اجر آخرت پر لگی رہتی ہیں وہ صرف خوش حالی ہی میں نہیں بلکہ غربت و افلاس میں بھی انفاق کرنے کے لئے بے تاب رہتے ہیں درج ذیل آیتیں ان کے اسی کردار پر روشنی ڈال رہی ہیں۔

وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (سورۃ آل عمران: ۱۳۳-۱۳۴)

اور بڑھو اپنے رب کی مغفرت اور جنت کی طرف جسکی وسعت آسمانوں اور زمین کی وسعت کی طرح ہے جو تیار کی گئی ہے ان متقیوں کے لئے جو خوش حالی اور تنگی میں خرچ کرتے ہیں اور جو غصے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں سے درگذر کرتے ہیں اور اللہ ایسے ہی خوب کاروں کو پسند کرتا ہے۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ خوش حالی اور غربت و افلاس دونوں حالتوں میں دین کے تقاضوں پر خرچ کرنا تقویٰ کا وہ اعلیٰ ترین مقام ہے جس پر فائز ہونے والے ہی جنت کے حقدار ہو سکتے ہیں۔

بقیہ: پردہ ۔۔۔۔۔۔

لیکن اگر کسی چیز سے روکنے کیساتھ ساتھ اس کا ضرر رساں ہونا بھی واضح کیا جائے تو اسکی جانب رغبت پیدا نہیں ہو سکتی۔ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے منع کیا جاتا ہے۔ پھر کسی کے دل میں اسکی خواہش کیوں نہیں پیدا ہوتی؟ اسلئے کہ اسے بتایا جاتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کرنے سے ہاتھ جل جائے گا۔ یہی حال بے پردگی اور آزادانہ اختلاط کا ہے۔ اگر ان کے سماجی، اخلاقی اور دینی مضرات بتائے جائیں اور ان پر پابندی کی حکمتیں واضح کی جائیں تو لوگوں میں ان کی طرف رغبت پیدا نہیں ہوگی۔

علامہ زمخشری اور ان کی تفسیر الکشاف

نظام الدین اصلاحی
شیخ التفسیر کلیۃ البنات جامعۃ الفلاح

یہ مقالہ ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے زیر اہتمام منعقدہ علمی مجلس میں ۱۳ فروری ۱۹۹۵ء کو پیش کیا گیا تھا افادہ عام کی غرض سے نذر قارئین کیا جا رہا ہے۔ (ق)

تفسیر کی ضرورت و اہمیت

قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف ادوار میں انسانوں کی ہدایت کے لئے انبیاء مبعوث فرمائے اور ان پر کتابیں نازل فرمائیں اور یہ صراحت بھی قرآن میں موجود ہے کہ ہر قوم کو کتاب الٰہی اسی زبان میں دی گئی جو مخاطب قوم کی زبان تھی۔ فرمایا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (ابراہیم: ۴)

ہم نے ہر رسول کو اس کی اپنی قوم کی زبان میں مبعوث کیا تاکہ وہ ان کے سامنے اس کی وضاحت کر سکے۔

اسی اصول بعثت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب بھی حضرت محمدؐ پر ان کی اپنی زبان یعنی عربی مبین میں نازل فرمائی۔

قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ (سورۃ زمر: ۲۸) یہ عربی زبان میں اتری ہوئی کتاب ہے اس میں کوئی کجی نہیں ہے۔

قرآن مجید کے عربی زبان میں نازل ہونے کے باوجود یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر عربی داں اس کی ہر آیت کو سمجھ لے کیونکہ قرآن مجید کی بہت سی آیتیں ایسی ہیں جن کو تفسیر کے علاوہ

کوئی نہیں سمجھ سکتا اور بعض آیتیں ایسی ہیں جن کو خاص صلاحیت لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں اور کچھ آیتیں ایسی بھی ہیں جن کو ہر جاہل و عامی سمجھ لے گا۔ اسی لئے قرآن مجید کو سمجھنے کیلئے ایک نبی کی اور اس کی تشریح و توضیح کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الْکِتٰبَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ (نحل: ۴۴)

ہم نے یہ کتاب آپ پر اس لئے اتاری ہے تاکہ آپ اس کی تعلیمات لوگوں پر واضح کر دیں۔

مذکورہ بالا آیتوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ہر نبی اپنے دور میں اپنی کتاب کا مفسر ہوتا ہے اور آخری نبی بھی اپنی کتاب کے مفسر تھے۔ اسی لئے ارشاداتِ رسول کو فہم قرآن کے معاملے میں کلیدی مقام حاصل ہے جس کے بغیر کتاب الٰہی کو سمجھا نہیں جا سکتا۔

تدبر قرآن

اللہ تعالیٰ نے تدبر قرآن پر بار بار ابھارا ہے اور لوگوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس کتاب پر غور و فکر کریں۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد: ۲۴)

کیا یہ لوگ قرآن مجید پر غور نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر تالے پڑ گئے ہیں۔

لِیَدَّبَّرُوْا اٰیٰتِهٖ (ص: ۲۹) تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید غور و فکر کرنے اور تدبر کرنے کی چیز ہے۔ اسی لئے ہمیشہ ارباب علم نے قرآن مجید پر غور و فکر کیا ہے اور اس کی مختلف انداز سے تفسیریں بھی مرتب کی ہیں۔ حضرت علیؓ کا یہ مقولہ صحیح ہے کہ القرآن لا تنقضی عجائبہ

قرآن مجید کے ساتھ ملت کا برتاؤ

مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآن مجید سے ملت کو ہٹانے کی بھی مختلف ادوار میں کوششیں کی گئیں اور اس زمانے میں بھی اس کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چونکہ قرآن مجید انسان کے ظاہر و باطن، دنیا و آخرت اور معاش و معاد کی چیزوں سے بحث کرتا ہے۔ اس لئے اسے انسانی زندگی

کا دستور حیات کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ زندگی کا کوئی بھی پہلو ایسا نہیں ہے جس سے اس میں بحث نہ کی گئی ہو اور اس کے بارے میں واضح ہدایات نہ دی گئی ہوں۔ اس لئے قرآن مجید کا صحیح تعارف یہ ہے کہ وہ کتاب تزکیہ بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ قانون ملکی بھی ہے۔ نہ تو وہ صرف کتاب تزکیہ ہے کہ انسان کو رہبانیت کا علم بردار بنا دے اور نہ ہی صرف قانون سیاست ہے کہ وہ انسان کو ایک دنیا دار بادشاہ کی شکل میں ڈھال دے۔ چونکہ قرآن مجید ان تمام تعلیمات کا جامع ہے اسی لئے مختلف ادوار میں مفاد پرست لوگوں کی جانب سے اس پر ظلم بھی کیا گیا ہے اور خود اس کے ماننے والوں نے اس کے ساتھ غیر مناسب برتاؤ کیا ہے۔

شاہان وقت اور قرآن مجید

بعض مسلم بادشاہوں نے اپنے اپنے زمانے میں سیاسی قوت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے استعمال کرنے کے بجائے ہوس ملک گیری کے لئے استعمال کیا اور حدود مملکت کو وسیع کرنے اس کے لئے جنگیں لڑتے رہے اور پھر داد عیش دینے کے لئے اس سیاسی قوت کو استعمال کرتے رہے۔ اسی لئے ہر دور میں کچھ ایسے علماء سوء پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اقتدار وقت کو خوش رکھنے کے لئے قرآن فہمی سے عوام کو دور رکھنے کی بھرپور کوشش کی تاکہ وہ اسلامی تصور سیاست و اجتماعیت سے نا آشنا ہو جائیں اور اقتدار وقت کے لئے پریشانی کا سبب نہ بن سکیں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عوام کی اکثریت ہمیشہ غیر تعلیم یافتہ اور جاہل رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اوہام و خرافات کی دلدادہ بھی۔ عوام کو بے سروپا واقعات، قصے کہانیاں اور حیرت انگیز داستانیں بہت پسند آتی ہیں۔ چنانچہ ان کی اس کمزوری کو سامنے رکھ کر ان کو فہم قرآن سے دور رکھنے کی بھی کوشش کی گئی اور ساتھ ہی قصہ گوئی کے ذریعے مقبولیت، شہرت اور عزت حاصل کرنے کی بھی کوشش ہوئی۔ کیونکہ عام لوگوں کو اس طرح کا واقعہ بہت پسند آئے گا کہ فلاں بزرگ پانی کے اوپر پیدل چل کر سمندر پار کیا کرتے تھے

اور فلاں بزرگ شیر کو پکڑ لیتے تھے۔ اسے بعض گھوڑے کے طور پر اپنی سواری کیا استعمال کرتے تھے۔ بعض صوفیاء نے اس میدان میں کمال حاصل کیا اور لوگوں کے لئے وجہ کشش بنے رہے جس سے انکی دنیا بھی بن گئی اور اقتدار وقت بھی خوش ہو گیا اسی لئے مسلم بادشاہوں نے علماء سو کی پوری طرح سرپرستی کی اور علماء حق کو جیلوں میں بند کیا۔ جہانگیر کے زمانے میں مجدد الف ثانی مستحق زنداں قرار پائے اور درباری علماء مستحق انعام و اکرام قرار پائے۔

جب بہت سے علماء نے یہ دیکھا کہ عوام میں صوفیاء کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے اور وہی مرجع خاص و عام بن رہے ہیں تو انہوں نے بھی قصہ گوئی کا راستہ اپنا کر مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس کام کے لئے ضروری تھا کہ وہ لوگوں کو قرآن فہمی سے دور رکھتے۔ کیونکہ اس قرآن میں صرف یہی نہیں کہا گیا ہے کہ

اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا (احزاب: ۴۲)

اور اللہ تعالیٰ کو بہت زیادہ یاد رکھو اور صبح و شام اسکی تسبیح پڑھتے رہو۔

بلکہ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا (النساء: ۷۵)

کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کے راستے میں اور ان دبا لئے گئے مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر جنگ نہیں کرتے جو اللہ سے دعا کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اے اللہ تو ہمیں ظالموں کی اس بستی سے نکال دے اور اپنی جانب سے ہمارے لئے حامی و ناصر پیدا فرما دے۔

ابلیس قرآن مجید کی اس حقیقت کو سمجھ گیا تھا۔ اسی لئے اس نے کہا تھا ؂

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

ظاہر ہے کہ اتنی اہم کتاب کی پیروی اس کو سمجھے بغیر کس طرح ممکن ہے اور یہی وجہ

ہے کہ دشمنانِ اسلام نے مسلمانوں کو قرآن فہمی سے دور کرنے کی پوری جد وجہد کی اور افسوس کہ مسلمانوں کی بڑی اکثریت اس دام فریب میں پھنس چکی ہے کہ قرآن کی تلاوت کرنے سے ہر حرف پر ہزار نیکیاں ملتی ہیں اور وہ مستحق جنت بن جاتا ہے۔ چنانچہ اب بغیر سمجھے بوجھے قرآن کی تلاوت کرتے رہنا اور بغیر سمجھے بوجھے اس کو یاد کرتے رہنا ان کے نزدیک نزول قرآن کا مقصد بن گیا ہے اور اس ثواب کو علماء حفاظ اور واعظین بڑے زور دار الفاظ میں بیان کرتے رہتے ہیں۔

قرآن مجید جن حکمتوں، مصلحتوں اور اصلاح و انقلاب کی بے بہا تدبیروں پر مشتمل ہے جب تک ان سے علم و آگہی حاصل نہ کی جائے اس کی اتباع کرنا ممکن نہیں یا اسی وقت ممکن ہے جب ہم اس کو سمجھنے اور اس پر تدبر کرنے کی کوشش کریں۔

دور حاضر میں عربی زبان و ادب سے کافی دوری پیدا ہو گئی ہے اور خاص طور سے ہندوستان میں عربی داں حضرات کی تعداد دن بہ دن کم ہوتی جا رہی ہے اور جو عربی ادب سے واقف ہیں وہ بھی فہم و تدبر سے خالی ہوتے جا رہے ہیں۔ اس لئے قرآن فہمی کی اہمیت بھی کم تر ہوتی جا رہی ہے۔ لہٰذا اس کی طرف جتنی زیادہ توجہ دی جائے کم ہے۔

یہ کتاب عجیب و غریب علمی ذخائر کی جامع ہے، اور انسانوں کی دنیوی اور اُخروی فلاح کی ضامن ہے۔ پھر بھی قرآنی نسخوں کی طباعت اور حفاظ کی کثرت کے باوجود مسلمان زوال کا شکار ہیں۔ ہمارے اسلاف کی ترقی کا راز اسی بات میں مضمر تھا کہ انہوں نے قرآن فہمی کی طرف کما حقہ توجہ کی اور صرف قرآن فہمی کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ اس کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اپنی زندگیوں کو اس کی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالنے کی کامیاب جد وجہد کی۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات اور عمل کے ذریعے قرآن مجید کی جو تفسیر بیان فرمائی اس سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

صحابۂ کرام قرآن مجید کو حفظ کرنے سے پہلے سمجھنے کی کوشش کرتے اور

جب تک اس پر عمل نہ کریں گے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ تفسیر کی اہمیت و ضرورت سمجھنے کے لیے مذکورہ بالا آیات کا حوالہ کافی ہے۔ چنانچہ علمائے امت نے اس کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس کی طرف کما حقہ توجہ فرمائی اور مختلف زاویوں سے کلام پاک کی تفسیر کی اور ان کا بڑا مقام ہے۔ حقیقت ہے کہ ان علمائے متقدمین نے اپنے تفسیری کارنامے کے ذریعے ملتِ اسلامیہ پر عظیم احسانات کیے ہیں۔ اس مختصر سی مجلس میں تمام تفاسیر پر اظہار خیال تو ممکن نہیں ہے البتہ ان میں سے ایک اہم تفسیر علامہ زمخشری کی کشاف پر کچھ اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔

علامہ زمخشری اور ان کی تفسیر

دنیائے تفسیر میں علامہ زمخشری کا مقام نہایت بلند ہے۔ یہ اپنے دور کے یکتائے روزگار مفسر گزرے ہیں اور انہوں نے اپنی تفسیر کے ذریعے کتب تفسیر میں جو اضافہ کیا ہے اس کی اہمیت اور قدر و منزلت کا اعتراف ہر دور میں کیا گیا ہے۔ باوجودیکہ اس تفسیر میں کہیں کہیں انہوں نے اپنے خاص عقیدہ اعتزال کو بھی مدنظر رکھا ہے اور اسے آیات قرآنی کے ذریعے مدلل اور مستحکم کرنے کی جد و جہد بھی کی ہے۔ اس کے باوجود اہل علم نے اس تفسیر کو علم و حکمت کا خزانہ قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تشنگانِ علوم قرآنی اس تفسیر سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ اس تفسیر کی خصوصیات پر آگے بحث کی جائے گی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بحث سے پہلے علامہ کے حالاتِ زندگی پر بھی تھوڑی سی روشنی ڈال دی جائے۔

نام و نسب

ان کا نام محمود بن عمر ہے، کنیت ابوالقاسم اور نسبت خوارزمی ہے۔ مسلکاً حنفی اور معتزلی تھے۔ ۲۷ رجب ۴۶۷ھ میں زمخشر کے مقام میں پیدا ہوئے۔ یہ خوارزم کے علاقے میں ایک گاؤں کا نام ہے۔ چونکہ اس دور میں بغداد مختلف علوم و فنون کا گہوارہ اور اکابر فن کا مسکن تھا۔ اسی لئے یہ شہر تشنگانِ علم کا مرکز بنا اور اس کی مرکزیت صدیوں تک قائم رہی۔ اس لئے علامہ زمخشری صاحب کشاف

بھی کسب فیض کے لئے داخل بغداد ہوئے اور وہاں کے اکابر علماء کے علم و فضل سے فیض یاب ہوئے۔ اسی طرح ایک دوسرے مرکز علم خراسان بھی گئے اور یہاں بھی علماء وقت سے رجوع کیا اور اپنی علمی پیاس بجھائی۔ غرضیکہ انہوں نے جہاں کہیں کوئی چشمۂ صافی پایا اس سے سیراب ہونے کی بھرپور کوشش کی اسی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسی بے نظیر تفسیر مرتب کی جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس تفسیر میں نحو و لغت اس کے اسرار و رموز اور فصاحت و بلاغت کا ایک سمندر کوزے میں بند کیا ہے۔

کشاف کا مقام

اس تفسیر کی عظمت کو ان کے مخالفین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ ان کے معتزلی نظریات کو نظر انداز کرتے ہوئے دیکھا جائے تو یہ تفسیر ہے جس میں قرآن مجید کے وجوہِ اعجاز اور قرآنی فصاحت و بلاغت کا بہترین خزانہ ملے گا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کو ادب عربی کا ذوقِ سلیم جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہوا تھا۔ اس کا یہی تقاضا تھا کہ وہ ادب قرآنی کے اسرار و رموز کو کھولتے اور پڑھنے والوں کو اس فن کی باریکیوں سے مالا مال کرتے۔ وہ عربی زبان کے یکتائے روزگار تھے۔ ان کے علمی تفوق اور نحوی مہارت کی جھلک ان کی تفسیر میں نمایاں طور پر ملے گی زمخشری اس بات پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ مفسر قرآن کو عربی ادب اور علم معانی و بیان میں پوری مہارت حاصل کرنی چاہیئے چونکہ زمخشری خود اس کمال سے متصف تھے اس لئے انہوں نے نہایت ہی قلیل مدت میں اتنی عظیم تفسیر مکمل کر لی اور اس کی عظمت کا اعتراف لوگوں سے کرا لیا۔ انہوں نے اپنے مقدمہ تفسیر میں لکھا ہے کہ میں نے یہ تفسیر اتنی قلیل مدت میں مکمل کر لی ہے جو عہد خلافت صدیقی کے برابر ہے یعنی ۲ سال تین ماہ اور نو دن اس میں صرف ہوئے۔ خود لکھتے ہیں کہ

"میرا اندازہ یہ تھا کہ میں اس تفسیر کو تیس سالوں میں پایۂ تکمیل تک پہونچا سکوں گا مگر یہ حرم محترم کا فیضان تھا کہ اتنی قلیل مدت میں یہ کام پورا ہو گیا۔ یہ تفسیر ربیع الآخر ۵۲۸ھ میں مکمل ہوئی۔"

(غلام احمد حریری: تاریخ تفسیر و مفسرین ص ۳۳۹)

علامہ زمخشری اپنے اس کارنامے پر بہت خوش اور نازاں تھے اور اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔

ان التفاسیر فی الدنیا بلا عدد　　ولیس فیھا لعمری مثل کشافی

ان کنت تبغی الھدیٰ فالزم قراءته　　فالجھل کالداء و الکشاف کالشافی

”دنیا میں تفسیریں تو بہت ہیں مگر بخدا میری کشاف جیسی کوئی نہیں ہے۔ اگر تو ہدایت چاہتا ہے تو اس کو پابندی سے پڑھا کر۔ کیونکہ جہالت بیماری ہے اور میری تفسیر کشاف مرض سے شافی ہے۔“

زمخشری کا یہ فخر بجا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب یہ اپنی تفسیر میں اشعار عرب سے استشہاد کرتے ہیں تو صاحب ذوق جھوم جھوم جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر نے یہ شعر اسی موقع کے لئے اور علامہ زمخشری کے استشہاد کے لئے کہا تھا۔ انہوں نے بڑے ہی مشکل اور نازک اشکالات کو اپنے اس طریقہ استدلال سے حل کر دیا ہے۔ چنانچہ ان کی اس تفسیر پر کسی نے نقد کیا ہے تو وہ ان کے عقیدۂ اعتزال کی وجہ سے کیا ہے اور بس۔

علامہ زمخشری کے موافقین اور مخالفین نے جس کثرت سے اس تفسیر کے شروح و حواشی لکھے ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ تفسیر بہت ہی لائق و فائق تفسیر ہے اور اس قابل ہے کہ اصحاب علم اس کی طرف توجہ فرمائیں۔ مخالف و موافق سبھی حضرات نے اس تفسیر کو بنیادی کتب میں شمار کیا ہے اور کہا ہے کہ رموز قرآنی کا کوئی طالب علم اس تفسیر کو نظر انداز نہیں کر سکتا ہے جس طرح تفسیر ابن کثیر روایات پر مشتمل ہونے میں فقید المثال ہے اسی طرح کشاف نحو و بلاغت اور حل مشکلات میں اپنی مثال آپ ہے۔

علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ کتب تفسیر میں کشاف کا مقام بہت اونچا ہے۔ جمہور علمائے اہل سنت زمخشری کی اس تفسیر کو بنظر استحسان نہیں دیکھتے اس لئے کہ اس کا مصنف معتزلی ہے اور اپنے خیالات و عقائد کو قرآن مجید کی آیات کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر اسی کے ساتھ تمام علمائے ادب و بلاغت زمخشری کی برتری اور بلندیٔ درجات کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں علامہ

احمد حریری نے اپنی کتاب تاریخ تفسیر و مفسرین میں علامہ تاج الدین السبکی کا یہ خیال نقل کیا ہے کہ ”کشاف اپنے باب میں عظیم کتاب ہے اور اس کا مصنف امام فن ہے مگر وہ مبتدع ہے۔“

کشاف کی خامیاں

زمخشری نے فضائل کے سلسلے میں نہایت ہی موضوع اور اسرائیلی روایات کو اپنی تفسیر میں جگہ دی ہے اور اس طرح ان کا ذکر کرتے ہیں گویا ان کے نزدیک یہ ثابت شدہ حقیقتیں ہیں۔ خاص طور سے اکثر سورتوں کے آخر میں ان سورتوں کی اہمیت و فضیلت بیان کرنے میں بے احتیاطی سے کام لیتے ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ وہ دیگر امور و معاملات میں بھی اسرائیلی اور موضوع حدیثوں کو بنیاد بناتے ہیں جو کسی طرح اس جیسی بلند و پایہ تصنیف کے لئے مناسب نہیں ہے۔ مثلاً آیت:

وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ (نمل: ۸۲)

کی تفسیر لکھتے ہوئے انہوں نے اس جانور کی تفصیل اسرائیلی روایات کی بنیاد پر بہت اہمیت کے ساتھ بیان کی ہے۔

بقیہ:- جامعہ کے لیل و نہار۔

سے دست بدعا ہے کہ وہ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے اور ان کے ورثہ کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔

قارئین حیات نو سے عموماً اور فلاحی برادری سے خصوصاً دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

تفسیر سورۂ اخلاص از علامہ فراہی - ایک مطالعہ

ملک وسیم احمد
جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

علامہ حمید الدین فراہی (۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء - ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء) کی بیشتر تصنیفات عربی زبان میں ہیں۔ اردو میں انہوں نے بہت کم لکھا ہے۔ سورہ اخلاص کی تفسیر اردو میں ہے مگر یہ بھی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے۔ اس کی حیثیت جستہ جستہ نوٹس کی ہے۔ کئی مقامات پر خالی بیاض ہے جو آئندہ پر کرنے کے خیال سے چھوڑ دی گئی تھی مگر پھر کبھی پوری نہ کی جا سکی۔ اس کے باوجود بھی جب اس تفسیر کا جائزہ ادبی حیثیت سے لیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس مختصر سی تفسیر میں زبان کے رمز شناسوں اور شائقین ادب کے لئے کافی سامان موجود ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے، استعارات و تشبیہات اور سورہ کے الفاظ و مفاہیم کے بیان کے لئے مناسب ترین الفاظ و تعبیرات کا انتخاب اس تفسیر کو اعلیٰ ادبی مقام دینے کے لئے کافی ہے۔

اصل تفسیر سے قبل ایک مختصر سا دیباچہ ہے جس میں اول یہ بات بتائی گئی ہے کہ قرآن ایک ایسا کلام ہے جو کھلا اور آسان بھی ہے اور چھپا اور مشکل بھی۔ مگر یہ اجتماع ضدین ہے دو مختلف پہلوؤں سے ہے۔ ایک پہلو یہ ہے کہ ضروری اور عام تعلیم کے لحاظ سے یہ نہایت آسان ہے۔ دوسرے، دقیق مضامین اور اعلیٰ تعلیم کے لحاظ سے مشکل بھی ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے تاکہ ہر ایک اپنی اپنی استعداد کے مطابق اعلیٰ ترقی تک پہونچ سکے۔ قرآن کا یہ اندرونی نظام فرق مراتب کی دلیل بھی ہے ہر ایک کو کوشش کرنی چاہیئے کہ اس کے دقیق مضامین تک پہونچ سکے۔ مگر اپنی لیاقت جتنی ہے اس سے زیادہ خیال کرنا اور یہ سمجھنا کہ یہ فہم قرآن کے لئے کافی ہے غلط ہے اس ضمن میں مولانا فراہیؒ کا بلیغ بیان ملاحظہ ہو: "پس قرآن نے صاف طرح پر اعلان کر دیا

کہ اس دریا سے بقدر اپنے ظرف کے پانی لے لو تمام دریا کو اپنی کلھیا میں بھرنے کی ہوس نہ کرو۔ صحابہ اس نکتے کو خوب سمجھتے تھے۔ اگر کسی جگہ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو خواہ مخواہ اس میں الجھتے نہ تھے۔ یہ اس لئے تھا کہ بقدر ہدایت قرآن نہایت کھلا تھا۔ دریا سے عبور کر کے اپنی منزل مقصود تک پہونچتے تھے مگر اس کی تمام وسعت کو ناپنے کی تمنا نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ وہ اسے غیر محدود اور ناپیداکنار جان گئے تھے ہاں ہر شخص بقدر اپنے فہم اور قوت فکر کے اس سے جواہر نکالتا تھا اور عام شاہراہ سے ادھر ادھر جو دلکش جزیرے آباد تھے ان کا انکشاف کرتا تھا جیسا کہ حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ اس دریا کے عجائبات کبھی ختم نہ ہوں گے"

سورہ کی تفسیر آیات کے ترجمہ سے شروع ہوتی ہے۔ پھر ذیلی عناوین کے تحت مختلف موضوعات زیر بحث آتے ہیں۔ سب سے پہلا عنوان محبت الٰہی ہے جسے ایمان اور تعلیمات قرآن کی غرض بتایا گیا ہے۔ یہی تمام انبیاء کی تعلیم کا مرکز و محور رہا ہے اور پورا قرآن اسی کی تعلیم سے لبریز ہے۔ اسی کی تعلیم دیگر صحائف اور آسمانی کتب میں بھی دی گئی تھی مگر اس کی تکمیل قرآن پاک کے ذریعہ ہوئی۔ محبت الٰہی جو دین کی غایت اور اخلاص جو اس محبت کی جان ہے اس کی تکمیل کیوں اٹھا رکھی گئی تھی اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ فراہی رقمطراز ہیں: "ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔ آغاز طفلی میں بچہ کی تعلیم کان اور زبان سے نہیں بلکہ آنکھ اور اشاروں سے ہوتی ہے۔ جب وہ سخن آشنا ہوا تو امر و نہی اور امید و بیم کے قریب الوقوع وعدوں سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن جب وہ زیور عقل سے آراستہ ہوا تو اس سے کسی کام کو بے سمجھے کرنے کی توقع رکھنی عبث ہے۔۔۔۔" اسلام تمام شعبہ ہائے حیات کو محیط ہے اس کے اندر ہر دور کے جدید تقاضوں کو سمجھنے اور اپنے اندر سمو لینے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ عقل کو معطل رکھنے کے بجائے اس نے عقل کے کامل استعمال پر ابھارا ہے۔ اس کی بنیاد علم پر ہے۔ اور علم کا سرچشمہ "کیا؟" اور "کیوں" بالفاظ دیگر معرفت اور محبت ہے معرفت

سے تصور حاصل ہوتا ہے اور حجت سے تصدیق۔ ہزارہا سال کے ارتقائی عمل سے گذر کر دین کو تصور اور تصدیق کی غیر متزلزل بنیادیں فراہم کی جا چکی ہیں اس لئے کہ "جس وقت بچپن گذر گیا ہو اور عقل کے بلوغ کا زمانہ آ گیا ہو۔ جب کہ معلم اس کو مکتب سے آزاد کرنا چاہے اور شاگرد کو سند تکمیل دے کر استاد بنانا چاہے تو اس وقت علم کے ساتھ حکمت کی بھی ضرورت ہے اور قواعد کے ساتھ حجت کی بھی حاجت ہے تاکہ درختِ علم آبِ علم سے ہمیشہ سیراب رہے اور قصرِ ہدایت مثل کوہِ راسخ کے ہمیشہ کی مرمت سے بے نیاز ہو جائے۔ اور جو بشارت کہ حضرت کلیم اور حضرت مسیح علیہما السلام تکمیل حکمت کی دے گئے تھے وہ پوری ہو۔" عمل کی بنیادیں اگر علم پر استوار ہوں تو استحکام کے باعث اسے حکمت کہا جاتا ہے اور اگر عمل کی بنیاد علم پر نہیں ہے تو بقول علامہ وہ نقش برآب ہے۔ نہ اسے کوئی معجزہ قائم رکھ سکتا ہے اور نہ کوئی وعدہ حور و قصور اور اگر اس کا وجود بظاہر نظر آتا ہو تو وہ محض سراب کی نمائش ہے۔

معرفت اور حجت کے علم یا دوسرے الفاظ میں "کیا" اور "کیوں" کے سوال کے اندر انسان کی تمام ترقی پوشیدہ ہے اور انسان اور دوسرے جانداروں میں یہی مابہ الامتیاز ہے علم و حکمت اور فہم و فراست کے تمام خزانوں کی کنجی یہی سوال ہے۔ ان کا جواب معلوم نہ ہو تو "ہر ایک قدم پر اصلی علم سے دور ہوتے جاؤ گے اور تاریکی پر تاریکی چھاتی جائے گی۔ بنیاد کی غلطی ذرا بھی ہو تو بھی بہت بڑی ہے۔ ایک ہی نقطہ سے دو خط کھینچو جن میں بال برابر فاصلہ ہو پھر دیکھو کہ جوں جوں وہ آگے بڑھتے جائیں گے ان میں فاصلہ زیادہ ہوتا جائے گا۔"

اسی سلسلہ بیان میں علامہ اس عام نظریہ پر کہ تمام مذاہب کی منزل ایک ہے بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ بات ایک پہلو سے صحیح بھی ہے مگر دوسرے پہلو سے بالکل غلط ہے اور اکثر لوگ اسی پہلو کو سمجھتے ہیں۔ مذہب کی ابتدا بیشک ایک ہی ہے مگر ان کی انتہا میں شک نہیں دو خطوں کے جو ایک نقطہ سے نکلے ہوں

بے انتہا فرق ہے۔

سورہ کا نام چونکہ اخلاص ہے اس لئے اس کی ضرورت اور سورہ کے عمود (خدا کی احدیت) پر بیک وقت روشنی ڈالتے ہوئے یہ دلکش الفاظ ملاحظہ ہوں "اب اس خاص مسئلہ محبت الٰہی کو دیکھو، اس میں سب سے زیادہ اخلاص کی ضرورت ہے اور دوسرے اخلاص کی، یعنی جب تمام دل اور عقل اور روح کو اس کی محبت کی نذر کر دیا تو پھر ہمارے پاس کیا رہا۔ بس یہ تو ہماری طرف سے اخلاص ہوا یعنی جو کچھ پاس تھا سب دے دیا۔ اب اس طرف سے دیکھو کہ اگر وہ تنہا نہیں بلکہ اس کے ساتھ اور بھی کوئی لگا ہوا ہے اور دوئی کی بو باقی ہے تو پھر یہ دعویٰ کہ ساری کی ساری متاع نذر اسی ایک کو دی غلط ہوگا۔"

سورہ اخلاص کے مضامین اور اس کی اہمیت کے اعتبار سے اسے ثلث قرآن کہا گیا ہے۔ یہ سورہ اگر توریت یا انجیل میں ہوتی تو عیسائی عقیدۂ تثلیث (TRINITY) کی مہلک بیماری میں نہ پڑتے۔ اسی لئے "اگرچہ یہ سورہ اپنے ظاہری انداز کے لحاظ سے تمام سورتوں میں ایسی چھوٹی ہے جیسے تمام بدن میں آنکھ کی پتلی مگر سارا عالم ہدایت اسی سے روشن نظر آتا ہے۔ محبت الٰہی کے لئے جس معرفت اور حجت کی حاجت ہے وہ ان چند آیتوں میں بکمال خوبی ظاہر کیا گیا ہے اور وہ محبت کی روشنی اور گرمی جو تمام قرآن میں پھیلی ہوئی ہے وہ یہاں ایک نقطہ پر منتج ہو گئی ہے۔ اگر دیگر مذاہب والے اس سورہ کو مان لیں جس کا ماننا ان پر عقل کی رو سے لازم بھی ہے تو گمراہی کی تمام ظلمت کافور ہو جائے اور دنیا خدا کے نور سے معمور ہو جائے جیسا کہ ہے بھی اگر دیکھیں چشم بینا۔ قرآن کہتا ہے کہ "خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے" (سورہ نور آیت ۳۵)

اس کے بعد ایک ایک کر کے سورہ کے الفاظ زیر بحث آتے ہیں بعض کلام میں اٹھ سکنے والے اعتراضات یا سوالات کا جواب بھی مولانا دیتے جاتے ہیں لفظ "احد" کے ذیل میں منطقی طرز استدلال اختیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کلمہ کو صرف

نظر سے دیکھنا غلطی ہے۔ بنظر تدبر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ وہ قدیم ہے اور باقی سب مخلوق ہیں۔ کیونکہ جو سب سے پہلے آپ ہی آپ تھا وہ ہمیشہ سے تھا اسی لئے ظاہر ہے کہ جو کبھی نیست تھا وہ خود تو ہرگز ہست ہو نہیں سکتا۔ اس لئے دو بات ماننی ضروری ہوئی ایک یہ کہ وہ ہمیشہ سے ہے اور دوسری یہ کہ اس کے سوا جو ہیں وہ سب اسی کی مخلوق ہیں ان کا انکار کرنا خلاف عقل ہے۔ پس یہ کہنا کہ وہ بے ہمہ (احد) ہے یہ کہنا ہوا کہ وہ قدیم لم یزل اور خالق کل ہے۔

اسلام نے خدا کا جو تصور دیا ہے وہ دیگر مذاہب کے تصور خدا سے بدرجہا اعلیٰ و ارفع اور اکمل ہے۔ نصاریٰ اسے باپ کہہ کے پکارتے ہیں۔ مگر والدین کے ساتھ انسان کو جو تعلق ہوتا ہے وہ بمقابلہ اس خدائے پاک کے ہیچ ہے اور اس ذات کا مکمل تصور مل جانے کے بعد بھی اس کو باپ کہتے رہنا نادانی اور ظلم ہے علامہ لکھتے ہیں "بس بالکل خلاف عقل اور خلاف انصاف ہوگا کہ ہم اس اعلیٰ نسبت کو زیادہ سے زیادہ باپ کے رشتے کے برابر سمجھیں ہاں باپ کا تصور ایک ناقص مثال اس اللہ جبری کی ہو سکتی ہے اور مذہب کی ابتدائی الف بے سیکھنے کے زمانے میں اس سے کچھ کام لیا جا سکتا ہے" اعلیٰ تصور مل جانے کے بعد بھی اس روش کو نہ چھوڑنا کیسا ہے اس کی مثال دیکھئے: "کیسی احمق وہ لڑکی ہوگی جو عروسی کے وقت بھی اسی گڑیوں کے کھیل میں محو رہے۔ بے شبہ اس نے اب تک نہیں جانا کہ دولہا کسے کہتے ہیں۔"

اسی طرح دیگر الفاظ سورہ پر بھی بڑی مفید بحثیں ہیں۔ پھر رفع دخل مقدر کے طور پر ایک عنوان باندھا ہے شرک تقاضائے فطرت نہیں۔ اظہار مدعا کے لئے جو زبان استعمال کی گئی ہے بہت جاندار اور دلچسپ ہے۔ اللہ کی حکمت اور رحمت کی وہ نشانیاں جو انسان کو سارے عالم میں نظر آتی ہیں علی ہذا وہ ایک انجانی سی کشش جو ہر مشکل کے وقت اپنے رب کی طرف محسوس ہوتی ہے دلیل ہے اس بات کی کہ شرک تقاضائے فطرت نہیں۔ یہ ایک قادر مطلق پر ایک گواہی ہے جب کہ ایسی کوئی

گواہی بتوں یا مردوں کے لئے نہیں ملتی۔ اب انسان کا فرض ہے کہ وہ اس ہستی کے ادراک کی کوشش کرے اور عقل کا وہ نور جو اسے ملا ہوا ہے اس کی روشنی میں آگے بڑھنے کی یہ صلاحیت اس کے اندر فطری ہے اور یہ صلاحیت ہی دراصل اس کی فطرت ہے۔ "جس قدر انسان نے آج تک ترقی کی ہے" علامہ فرماتے ہیں "یہ سب اسی کی قابلیت ہی کے آثار ہیں اور اسی کی فطرت ہی کے برگ و بار۔ یہ امر کہ قابلیت کا نام فطرت ہے کچھ انسان کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بچہ طاؤس جو ایک مضغہ گوشت ہے جب جوان ہوتا ہے تو اس کے پروں کی گلکاری کو ہم اس کی فطرت ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح بچہ انسان جو اکثر جانوروں کی نسبت زیادہ ضعیف الجثہ ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ضعیف العقل ہے جب اپنے شباب پر پہونچتا ہے تو کیا اس کی دانائی اور توانائی کو ہم اس کی اعلیٰ فطرت کا نتیجہ نہ سمجھیں۔" اخیر میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر توحید کا تصور ایسا فطری اور جبلی ہے تو پھر شرک کیسے در آتا ہے۔ اس سوال کا انتہائی شافی جواب ہمیں مولانا کے یہاں مل جاتا ہے کہتے ہیں شرک کی دو وجہیں ہیں ۱۔ غفلت یہ عقلی ہے ۲۔ دنائت، یہ اخلاقی ہے۔ غفلت یہ ہے کہ انسان کو عقل کا جو بیش بہا تحفہ ملا ہوا ہے اسے کام میں نہ لائے اور غلط تصورات و عقائد میں پڑا رہے۔ دنائت یا کمینگی یہ ہے کہ باوجود یکہ اس کے سر پر خلافت ارضی کا تاج رکھا گیا اور زمین و آسمان کے اندر جو کچھ ہے اس کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے وہ مخلوقات کی بندگی کرنے لگے اور اپنا اعلیٰ مقام بھول جائے۔

پردہ پر بعض اعتراضات کا جائزہ

محمد رضی الاسلام ندوی
ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ

پردہ پر بہت سے اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ اسے تمسخر کا موضوع بنایا جاتا ہے۔ اسے "ملاکی ایجاد" قرار دیا جاتا ہے۔ یہ اعتراضات اسلامی نظام معاشرت کی خصوصیات اس میں عورت کی حیثیت اور اس کے دائرہ کار سے ناواقفیت یا تجاہل کا نتیجہ ہیں۔ یہاں چند اعتراضات کا جائزہ لیا جا رہا ہے جنہیں پردہ کے مخالفین بہت زور و شور سے پیش کرتے ہیں۔

۱۔ آزادی سے محرومی

اس سلسلہ میں ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ عورت کو پردہ کا پابند بنانے سے اس کی آزادی سلب ہوتی ہے جو ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ مرد کی طرح عورت بھی انسانی وجود رکھتی ہے۔ اس پر کچھ ناروا پابندیاں عائد کر دینے سے اس کی انسانیت کی توہین و تذلیل ہوتی ہے۔ یہ اعتراض ذرا بھی وزن نہیں رکھتا۔

اسلام نے عورت کے لئے لازم کیا ہے کہ وہ نامحرم مردوں کے سامنے ایک خاص وضع اور خاص لباس میں آئے۔ یہ حکم بعض معاشرتی مصالح کی بنا پر دیا گیا ہے تاکہ لوگوں کے اخلاق پراگندہ نہ ہوں اور معاشرہ میں صنفی انتشار پیدا نہ ہو۔ اسے آزادی یا بنیادی انسانی حقوق پر قدغن نہیں قرار دیا جا سکتا۔ تمام متمدن معاشروں میں رہن سہن کے خاص طریقوں کی پابندی کی جاتی ہے مثلاً کسی کو اجازت نہیں ہوتی کہ وہ برہنہ ہو کر گھر سے باہر نکلے، یا سونے کا لباس پہن کر کام پر جائے۔ مگر اس پابندی کو فرد کی آزادی یا بنیادی انسانی حق کے خلاف نہیں قرار دیا جاتا۔

اسلام چاہتا ہے کہ عورت گھر سے باہر نکلے تو اپنے لباس، چال ڈھال اور گفتگو میں وہ طرز اختیار کرے جس سے کسی کے صنفی جذبات برانگیختہ نہ ہوں، وہ آرائش و زیبائش کے ذریعے لوگوں کی شہوت آمیز نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ نہ کرے۔ اس طرح اسلام اسے ساتر لباس کا پابند بنا کر معاشرہ کے افراد کی نگاہوں میں عزت و احترام کا مقام عطا کرتا ہے۔

۲۔ عملی سرگرمیوں سے علیحدگی

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ پردہ عورت کو زندگی کی مختلف سرگرمیوں میں حصہ لینے سے روک دیتا ہے۔ وہ گھر سے باہر کے کام نہیں انجام دے سکتی۔ اس طرح معاشرہ اپنی نصف آبادی کی فطری صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے سے محروم ہو جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ صرف اسلام ہی عورت کی فطری صلاحیتوں سے صحیح طریقے سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ کوئی بھی نظام اسی وقت ترقی کر سکتا ہے جب اس میں کاموں کی تقسیم مناسب ڈھنگ سے ہو اور جس کے ذمے جو کام لگایا جائے وہ پوری امانت داری اور محنت سے اسے انجام دے۔ اگر ہر شخص ہر کام انجام دینے لگے تو نظام میں خلل و فساد ناگزیر ہے۔ کوئی تجارتی کمپنی اسی وقت صحیح ڈھنگ سے چل سکتی ہے جب اس کے ملازمین میں سے کچھ لوگ اچھی سے اچھی مصنوعات تیار کرنے میں لگے رہیں اور کچھ دوسرے لوگ مارکیٹ میں اس کی پبلسٹی اور نکاسی کے لئے جد و جہد کریں۔ اگر اس کمپنی کا ہر ملازم ہر کام اپنے ذمے لے لے تو وہ ایک دن بھی نہیں چل سکتی۔ اسی طرح نظام تمدن کو چلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے درمیان کاموں کو تقسیم کر دیا ہے۔ عورت کو گھر کے اندر کے کاموں کی ذمہ داری دی گئی ہے اور مرد کو گھر سے باہر کے کاموں کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ بچوں کی پیدائش اور پرورش اور پرداخت ایسا کام ہے جسے صرف عورت ہی انجام دیتی ہے اس کے ساتھ یہ بڑی زیادتی ہوگی کہ اس طویل المیعاد اور محنت طلب کام سے تو اسے چھٹکارا نہ ملے اس

کے ساتھ ساتھ گھر سے باہر کے بھی بہت سے کام اس کے ذمے لگا دیے جائیں۔ اسی لئے اسلام نے عورت کو معاشی جد و جہد سے آزاد رکھا ہے اور نفقہ کی ذمہ داری کلیۃً مرد پر عائد کی ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام عورت کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ہی نہیں دیتا ہے اور اسے معاشرتی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے کلیتاً روکتا ہے۔ وقت ضرورت عورتوں کے لئے گھر سے باہر نکلنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ نے تم (عورتوں) کو اجازت دی ہے کہ اپنی ضروریات کے لئے گھر سے باہر جا سکتی ہو" (صحیح بخاری/کتاب التفسیر، سورہ احزاب)

عہد نبوی میں بہت سی صحابیات گھر سے باہر کے کاموں مثلاً کھیتی باڑی، صنعت و حرفت اور تجارت وغیرہ میں اپنے شوہروں کی معاونت کرتی تھیں اور غزوات میں شریک ہو کر زخمیوں کو پانی پلانے اور مرہم پٹی کرنے کی خدمت انجام دیتی تھیں۔

اسلام عورت کو ہر طرح کے معاشرتی، معاشی اور تمدنی حقوق عطا کرتا ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتی ہے۔ وقت ضرورت کسب معاش کر سکتی ہے۔ اپنا سرمایہ تجارت میں لگا سکتی ہے، علم و ثقافت کے فروغ میں حصہ لے سکتی ہے اجتماعی مفاد کے لئے اپنی خدمات پیش کر سکتی ہے۔ لیکن اسلام عورت کو "شمع محفل" نہیں بنانا چاہتا ہے۔ وہ مرد و زن کا آزادانہ اختلاط سخت ناپسند کرتا ہے۔ اس لئے کہ یہ چیز اس کے نظام معاشرت سے قطعاً میل نہیں کھاتی۔

۳۔ میلان میں اضافہ

پردہ کے سلسلہ میں ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ مردوں اور عورتوں کے درمیان آزادانہ اختلاط پر پابندی عائد کرنے سے عورتوں کی جانب مردوں کے میلان اور رغبت میں اضافہ ہوتا ہے اس لئے کہ کسی چیز سے روک دینے سے انسان کی حرص اس میں اور بڑھ جاتی ہے" اگر انھیں

کھلی چھوٹ دے دی جائے تو بہت جلد طبیعتیں سیر ہو جائیں گی اور جذبات سرد پڑ جائیں گے۔

بے پردگی کے حامیوں کا یہ استدلال بھی صحیح نہیں۔ اگر سرمایہ داروں کی تجوریوں میں مال و دولت کے ڈھیر دیکھ کر غریبوں کے دلوں میں اس کے حصول کی خواہش پیدا ہوتی ہو تو کیا یہ مشورہ دینا مناسب ہوگا کہ حفاظت کی تمام تدابیر ختم کر دی جائیں اور کھلی چھوٹ دے دینی چاہیئے کہ جو چاہے جتنا چاہے مال اٹھا کر لے جائے، اسی تدبیر سے لوگوں کے دلوں سے مال کی رغبت ختم کی جا سکتی ہے، کیا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اخلاقی جرائم پر پابندی سے انسانوں میں جرم کرنے کی خواہش ابھرتی ہے اگر ارتکاب جرائم کی مکمل آزادی دے دی جائے تو تمام جرائم پیشہ افراد پرہیزگار بن جائیں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ انسانی تمدن کی تاریخ کے کسی دور میں اس منطق کو استعمال نہیں کیا گیا۔

انسان کی فطری خواہشات دو طرح کی ہیں ایک محدود جیسے کھانے اور سونے کی خواہشات ان کی جب تکمیل ہو جاتی ہے تو ان سے انسان کی رغبت ختم ہو جاتی ہے۔ دوسری خواہشات وہ ہیں جو غیر محدود ہوتی ہیں مثلاً مال کی خواہش یا جنسی میلان کہ ان سے طبیعت کبھی آسودہ نہیں ہوتی۔ جنسی میلان کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک جسمانی دوسرا روحانی۔ جسمانی تسکین تو بسا اوقات ہو جاتی ہے لیکن روحانی آسودگی کبھی نہیں ہوتی بلکہ مسلسل هل من مزید؟ کا تقاضا رہتا ہے۔ مرد و زن کے آزادانہ اختلاط کی صورت میں خواہشات میں سکون اور ٹھہراؤ آنے کے بجائے انھیں اور ہوا ملے گی اور معاشرہ میں مزید بے حیائی اور آوارگی کو فروغ ہوگا۔

یہ بات بھی پورے طور پر صحیح نہیں کہ "جس چیز سے انسان کو روکا جاتا ہے اس کی حرص اس کے اندر مزید بڑھ جاتی ہے" ایسا اس وقت ہوتا ہے جب ایک طرف اسے روکا بھی جائے اور دوسری طرف اس کی رغبت بھی دلائی جاتے

بقیہ صـــ پر

پانچویں قسط

یہودیت

انیس احمد فلاحی مدنی

موجودہ یہودی تحریک اور اسرائیل کا قیام

اسرائیل کے قیام کا تاریخی پس منظر

عہد مہاجرت میں اسرائیل کے قیام کا سب سے پہلے تصور اس وقت پیدا ہوا جب نپولین بوناپارٹ نے ۱۷۹۹ء میں مصر پر حملہ کے دوران بیت المقدس کی تعمیر جدید کا وعدہ کر کے، افریقہ اور ایشیا کے یہودیوں کو اپنی فوج میں شامل کیا، لیکن اس کی شکست سے یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ (التاریخ الیہودی العام: صـ ۱۹۶)

ان کے بعد موسیٰ ہیس نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "روم سے بیت المقدس تک" لکھ کر فلسطین میں اسرائیلی مملکت کے قیام کا واضح تصور پیش کیا۔ ہیس کی اس تصنیف کے بعد ویانا کے ایک اخبار نویس تھیوڈور ہرتزل نے ۱۸۹۶ء میں "یہودی مملکت" نامی ایک کتاب لکھ کر اس تصور کو مزید اجاگر کیا۔ ہرتزل نے یہ کتاب اس وقت لکھی تھی جب ۱۸۹۴ء میں فرانسیسی فوج کے ایک یہودی کپتان کے مقدمہ میں محض یہودی ہونے کی بنیاد پر ظلم و بے انصافی کی گئی تھی۔ چنانچہ وہ عدالت سے یہ کہتے ہوئے باہر نکلا کہ جسے انصاف مطلوب ہو وہ نصرانیت اختیار کر لے۔ اس واقعہ سے وہ بے حد متاثر ہوا اور اس نے اپنی پوری زندگی ایک آزاد یہودی ریاست کے قیام کے لئے وقف کر دی تاکہ یہودی قوم کو اقوام عالم کے مظالم سے بچایا جا سکے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر ۱۸۹۷ء میں سوئٹزرلینڈ کے شہر بال کے ایک ہوٹل میں اس نے یہودی دانشوروں کی ایک اعلیٰ کانفرنس بلائی، اسی کانفرنس

میں یہودیوں کی عالمی تنظیم "صیہونیت" کی بنیاد ڈالی گئی۔ جس کا مقصد بڑی سیاسی طاقتوں کی بوقت ضرورت مداخلت اور پشت پناہی حاصل کرنا، نیز امیر و کبیر یہودیوں کے تعاون سے ایک اسرائیلی ریاست کا قیام عمل میں لانا تھا۔ (دیکھئے: المسألۃ الیہودیۃ ایلا صالحی صـ ۱۹۱)

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صیہونیت کی تاسیس میں روس و جرمن میں یہودیوں پر ہونے والے فسادات سے کہیں زیادہ فرانس میں ان کے ساتھ حکومت و عوام کے متعصبانہ رویہ کا دخل تھا (دنیا کے بڑے مذہب صـ ۳۶۰)۔ انہوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے برطانیہ سے ساز باز کی اور ۱۹۱۷ء میں برطانوی وزیر اعظم آرتھر جیمس سے وہ مشہور وعدہ لے لیا جسے وعدہ بلفور کے نام سے جانا جاتا ہے جس کی رو سے فلسطین کو یہودیوں کا وطن تسلیم کیا گیا تھا۔ برطانیہ سے وعدہ بلفور کے حصول کے تین ماہ بعد ہی فرانس نے بھی فلسطین میں یہودیوں کے اس حق کو تسلیم کر لیا۔

فلسطین کے انتخاب کے اسباب

سرزمین فلسطین کے حساس علاقہ کی وجہ سے بڑی طاقتوں (خصوصاً برطانیہ) کی جانب سے یہودیوں کے سامنے، اوغنڈا، صحراء سینا، صحرات شرقی افریقیا، جو اس وقت کے علاقے اسرائیلی ریاست کے قیام کے لئے پیش کئے گئے لیکن یہ دائرے قبول عام حاصل نہ کر سکی۔ اور بالاتفاق انہوں نے سرزمین فلسطین کا انتخاب کیا جس کے پیش نظر دو اہم سبب تھے۔

۱۔ دینی: فلسطین میں یہودیوں کے آباء واجداد رہ چکے ہیں۔ ان کا مرکزی معبد ہیکل سلیمانی وہیں جبل صیہون پر واقع تھا اور ان کی تاریخ کے سب سے مشہور دور عہد داؤدی اور عہد سلیمانی کی راجدھانی یہی شہر رہا ہے۔ کتاب مقدس میں ان سے اسی علاقہ کا وعدہ کیا گیا تھا۔ انہیں دینی وجوہ کی بناء پر فلسطین میں ہجرت کے لئے عام یہودی تو آسانی تیار ہو سکتے تھے لیکن یورپ و امریکہ کے ترقی یافتہ شہروں کو

چھوڑ کر بلا کسی دینی سبب کے وہ کسی دوسرے مقام پر ہرگز نہ آتے۔ اسی لئے برطانیہ کے وزیراعظم نے جب یہودیوں کے سامنے فلسطین کے علاوہ کسی دوسری جگہ کے انتخاب کی بات رکھی تو مشہور یہودی وایزمن نے کہا کہ: اگر موسیٰ علیہ السلام بذات خود آکر فلسطین کے علاوہ کسی اور سرزمین میں آباد ہونے کی دعوت دیں تو بھی کوئی ان کی اتباع کرنے والا نہیں ملے گا۔ (حرکۃ المقاومۃ الاسلامیۃ فی فلسطین، عبداللہ عزام ص۱۰-۱۱)

۲۔ سیاسی و عسکری۔ ملحد و بے دین یہودیوں کے نزدیک کتاب مقدس کے وعدہ کی کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن انھوں نے اسکے باوجود بھی فلسطین کا انتخاب کیا کیونکہ فلسطین یورپ، ایشیا، اور افریقہ کے بری و بحری راستوں کے بیچوں بیچ واقع ہے نیز یہ علاقہ حقیقتاً دنیا کی تمام طاقتوں کے حقیقی ارتکاز کی جگہ اور پورے عالم پر غلبہ و تسلط قائم کرنے کا سب سے عمدہ مرکز ہے (دیکھئے بکنندا موتمر بال میں پیش کیا گیا ناحوم جولڈمان کا مقالہ)

برطانیہ کی پشت پناہی کے اثرات

برطانیہ و فرانس کی پشت پناہی کے بعد یہودی مہاجرین کا زبردست سیلاب فلسطین میں امنڈ پڑا۔ حکومت برطانیہ ان مہاجرین کی ہر طرح کی اعانت و پشت پناہی کرتی رہی نیز مسلم حملوں سے انھیں بچاتی رہی اور عسکری و فوجی تربیت دیتی رہی پھر جب اسرائیلی حکومت کے قیام میں وہ اپنے آپ کو کمزور محسوس کرنے لگی تو اس نے یہ معاملہ اقوام متحدہ کے سپرد کر دیا جس کی قیادت امریکہ کے ہاتھوں میں تھی اقوام متحدہ نے صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد بڑی طاقتوں کے ایماء و اشارے پر فلسطین کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا اور اس تقسیم کا اعلان ۲۹ مارچ ۱۹۴۷ء کو کیا گیا۔

جب برطانیہ نے یہ دیکھا کہ یہود اب زمام حکومت سنبھال لیں گے تو اس نے فلسطین کی آزادی کا اعلان کر دیا اور برطانوی مندوب مسلمانوں کو پراگندہ و منتشر چھوڑ کر مئی ۱۹۴۸ء میں حیفا کے راستہ سے انگلینڈ روانہ ہو گیا۔ اسی دن تل ابیب میں یہودیوں

کی ایک اعلیٰ کانفرنس بلائی گئی جس نے مملکت اسرائیل کے قیام کا اعلان کیا۔ اسرائیل کے قیام کے گیارہ منٹ بعد ہی امریکہ نے اس کا اعتراف کر لیا اور اس کے بعد بقیہ تمام ہی بڑی طاقتوں نے اس کی قانونی حیثیت کو تسلیم کر لیا۔ فلسطین میں اسرائیلی مملکت کے قیام کے لئے یورپ کی جدوجہد کے پیش نظر دو عظیم مقصد تھے۔

۱۔ اپنے وطن و مملکت کو یہودیوں کی شر انگیزیوں، ریشہ دوانیوں اور ملک کے اموال پر مکر و فریب کے ذریعہ انکے قبضہ و تصرف سے بچانا کیوں کہ یہودی قوم کی یہ فطرت ثانیہ بن چکی ہے کہ کسی بھی علاقہ میں سکونت اختیار کرنے کے فوراً بعد ہی وہ وہاں کی آمدنی کے ذرائع پر قبضہ جما لیتے ہیں۔

۲۔ ملت اسلامیہ کے قلب میں اپنی ایک حلیف مملکت کا قیام تاکہ اس مملکت کے ذریعہ مسلم عوام اور حکومتوں کے درمیان اختلاف و انتشار کی ہوا بھڑکائی جا سکے اور یہ امت مغربی تہذیب و تمدن سے آنکھیں چار کرنے کے قابل نہ ہو سکے کیوں کہ وہ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ عالم اسلام کے پاس خام مال، معدنیات کے ذخائر، پٹرول و گیس کی فراوانی، عالمی فضائی و بحری راستوں کی کمی نہیں ہے اور اگر خدانخواستہ کبھی یہ امت اپنے دین و ایمان کی جانب پلٹ گئی اور جدید علوم و فنون کی جانب مائل ہو گئی تو پھر اس کی تہذیب و تمدن کا مقابلہ کرنا مغربی تہذیب کے بس کی بات نہیں ہے یہاں پر انھوں نے اپنی ایک اعلیٰ کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا کہ امت اسلامیہ کے قلب میں ایک اجنبی قوم کو بسا کر اختلاف و انتشار کی آگ کو برابر بھڑکایا جاتا رہے تاکہ یہ ترقی کی راہ پر کبھی گامزن نہ ہو سکیں، اور مغربی تہذیب (جو وقت کے چیلنج کے سامنے مضمحل کھڑی ہے) اسلامی تہذیب کے سامنے ماند نہ پڑ سکے۔

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کی اس سکونت سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشین گوئی کی تصدیق ہوتی ہے کہ:

"لا تقوم الساعۃ حتی تقاتلوا الیہود حتی یقول الحجر وراءہ الیہودی یا مسلم ھذا

یہودی وراٗی فاقتلہ" (صحیح بخاری کتاب الجہاد حدیث رقم (۲۹۲۶) و صحیح مسلم کتاب الفتن ۲۹۲۲)

قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ تم لوگ یہودیوں سے وہ جنگ نہ کرو جس میں وہ پتھر بھی جس کی آڑ میں کوئی یہودی چھپا ہوگا مسلمانوں سے یوں گویا ہوگا کہ اے مسلم یہ میرے پیچھے یہودی چھپا بیٹھا ہے اسے قتل کردے۔

ایک دوسری روایت ہے۔

"تقاتلکم الیہود فتسلطون علیہم حتی یقول الحجر: یا مسلم: ھذا یہودی ورائی فاقتلہ" (صحیح بخاری کتاب المناقب حدیث رقم (۳۵۹۳))

یہود تم سے جنگ کریں گے تو تمہیں ان پر غلبہ حاصل ہوگا یہاں تک کہ پتھر بھی کہیگا کہ اے مسلم: یہ میرے پیچھے یہودی چھپا بیٹھا ہے۔ اسے قتل کردے۔

یہ پیشین گوئی برحق ہے جس کا وقوع یقینی ہے۔ ایسی قوم کبھی فلاح و کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی جو اللہ کے نزدیک مغضوب و لعنت زدہ ہو، ممکن ہے فلسطین میں یہودیوں کا یہ اجتماع ان کی ناپاک و بدطینت نسل کے کلی استیصال کا پیش خیمہ ہو۔

کیا فلسطین میں یہودیوں کو سکونت کا تاریخی حق ہے؟

یہودیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ قدیم زمانے سے فلسطین میں آباد رہے ہیں صدیوں بعد رومی سلطنت نے انھیں وہاں سے نکلنے پر طاقتاً وعدواناً مجبور کیا تھا لہٰذا انھیں وہاں سکونت اختیار کرنے کا تاریخی حق ہے۔

یہود کا یہ دعویٰ صداقت سے کتنا ہم آہنگ ہے اس کو جاننے کے لئے اس علاقہ کی قدیم تاریخ پر ایک نظر ڈالنی ہوگی۔

یہود فلسطین میں یوشع بن نون کی قیادت میں ۱۱۲۵ قم میں داخل ہوئے تھے۔ فلسطین میں ان کے دخول کے وقت تین قبائل آباد تھے۔

۱۔ فینیقی قوم۔ یہ لوگ فلسطین میں ۳۰۰۰ قم میں آئے اور اس کے شمالی حصہ میں بحرابیض متوسط کے کنارے آباد ہوگئے۔

۲۔ کنعانی۔ یہ لوگ فلسطین میں ۲۵۰۰ قم میں داخل ہوئے اور اس کے منطقہ وسطی کو انھوں نے اپنی رہائش گاہ بنایا۔

مذکورہ بالا دونوں قبائل جزیرہ عرب سے ہجرت کرکے آئے تھے۔ ۱۲۰۰ قم میں جزیرہ کریت سے فلسطین نامی ایک قبیلہ وہاں پہونچا اور اس نے موجودہ غزہ اور شہر یافا کے درمیان سکونت اختیار کی۔ کنعانیوں نے انھیں فلسطین کے نام سے پکارا اور پھر اس نام کا اطلاق اس پورے علاقہ پر ہونے لگا (دیکھئے: الیہودیۃ احمد شلبی ص۴۱)

اس علاقہ کی تاریخ اور خود یہودیوں نے اس علاقہ کے تعلق سے اپنی کتابوں میں جو تفصیلات درج کی ہیں اس کی رو سے یہ قبائل اس علاقہ میں مستقل آباد رہے اور ان کے درمیان اور بنی اسرائیل کے درمیان یہود کے اس علاقہ میں سکونت کی پوری مدت کے دوران متعدد خونریز جنگیں ہوتی رہیں۔

اس پوری تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس علاقہ میں سکونت پہلے یہودیوں نے اختیار نہیں کی ہے فینیقی، کنعانی اور فلسطینیوں کے بعد ہی یہود اس علاقہ میں داخل ہوتے ہیں اور بعض مختصر ادوار کو چھوڑ کر کبھی پورے دور حکومت میں فلسطین کے تمام علاقوں پر نہیں بلکہ بعض پر ان کا قبضہ رہا ہے، نیز ۷۰ء میں ان کو وہاں سے جلاوطن کردیا گیا تھا جبکہ مذکورہ بالا تینوں قبائل اب تک وہاں آباد چلے آرہے ہیں اور مذہبی اعتبار سے انھوں نے پہلے عیسائیت اور ظہور اسلام کے بعد اسلام کو انھوں نے قبول کرلیا اس پوری تفصیل سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ یہودیوں کے فلسطین میں سکونت کا تاریخی دعویٰ حقیقت سے کوسوں دور ہے۔

نصیریت

افتخار الحسن مظہری

نصیری فرقہ دراصل ایک باطنی فرقہ ہے، جس کا ظہور تیسری صدی ہجری میں ہوا اس کو ماننے والے وہ غلو پسند شیعہ ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات میں الوہیت کے بعض مراتب کا عقیدہ رکھتے ہیں، ان کا بنیادی مقصد اسلام کی بیخ کنی کرنا اور مسلمانوں کے درمیان انتشار وافتراق کو بڑھاوا دینا ہے، تاکہ ملت کی شیرازہ بندی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ اسی لئے یہ لوگ اُن ہی طاقتوں کا ساتھ دیتے ہیں جو ارض اسلام کو تاخت کرنے کی غرض سے سر اٹھاتی ہیں۔

شام کے فرانسیسی انتداب نے سرکاری طور پر ان کا نام علوی رجسٹرڈ کر دیا تاکہ یہ نام ان کی شیعی حقیقت کو چھپانے کا حسین پردہ بن جائے۔ اور نام کا حسن ان کے مکروہ چہرے کو بے نقاب نہ ہونے دے۔

نمایاں شخصیات

اس فرقہ کا بانی ابو شعیب محمد بن نصیر بصری نمیری ہے (ت ۲۷۰ھ) شیعوں کے تین اماموں کی اسے معاصرت حاصل تھی یعنی اسے علی ہادی دسویں امام کا زمانہ بھی ملا اور گیارہویں امام حسن عسکری کا دور بھی اس نے دیکھا، اسی طرح بارہویں امام محمد مہدی کا عہد بھی پایا۔

اس کا دعویٰ تھا کہ امام حسن عسکری سے نسبت وتعلق کا وہی تنہا واسطہ ہے کیونکہ ان کے تمام علوم کی میراث اسی کو منتقل ہوئی ہے، اور وہی ان کے بعد دین کی حجت ہے لہٰذا عصور ما بعد میں شیعوں کا وہی مرجع ہے، اس کی یہ مرجعیت امام مہدی کے پردہ کر جانے کے بعد سے قائم ودائم ہے۔

اس شخص نے نبوت ورسالت کا دعویٰ کیا اور ائمہ کی عقیدت میں اتنا غلو کیا کہ الوہیت کی بعض صفات سے بھی ان کو متصف کر دیا۔

اس فرقہ کی سربراہی وپیشوائی میں محمد بن جندب اس کا جانشین ہوا۔

اس کے بعد ابو محمد عبداللہ بن محمد جنان جنبلانی جو فارس کے ایک علاقہ جنبلان کا باشندہ تھا (۲۳ - ۳۸۷ھ) اس کی کیفیت عابد وزاہد تھی۔ اس نے مصر کا سفر کیا، اور خصیبی کو اپنی دعوت پیش کی۔

حسین بن علی بن حسین بن حمدان خصیبی ۲۶۰ھ میں پیدا ہوا۔ اپنے استاد کے ہمراہ مصر سے جنبلان آیا اور فرقہ کی پیشوائی میں اسکی جانشینی کی۔ حمدانی بادشاہت کے زیر سایہ حلب میں متوطن رہا، اس نے نصیری فرقہ کے دو مراکز دعوت قائم کئے ایک حلب میں جس کی سیادت وپیشوائی محمد علی جلی کے سپرد کی اور دوسرا بغداد میں جس کی سیادت پر علی جسری کو مامور کیا۔ ہلاکو کے حملہ کے بعد بغداد کا نصیری مرکز تباہ وبرباد ہو گیا۔ اور حلب کا مرکز لاذقیہ منتقل ہو گیا جس کے پیشوائے اعظم ابو سعید میمون سرور بن قاسم طبرانی ہوئے۔ (۳۵۹-۴۲۷ھ) کردوں اور ترکوں نے پیچھے بعد دیگرے ان پر شدید حملے کئے جس کی وجہ سے امیر حسن مکزون سنجاری کا قیام عمل میں آیا (۵۸۳ — ۶۳۸ھ) اور علاقہ کو دوسروں کی دراندازی سے مامون بنانے کی کوشش کی گئی لیکن پہلی مرتبہ انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑا، دوسری مرتبہ انہیں کامیابی ملی اور انہوں نے لاذقیہ کے کوہستانی علاقوں میں نصیری فرقہ کے اصول وعقائد کی ضابطہ بندی کی۔

ان ہی میں، عصمۃ الدولہ حاتم طوبانی کا ظہور ہوا جو رسالہ قرصیہ کا مصنف ہے (۷۰۰ – ۱۳۰۰م)

انا کے علاقہ سے حسن عجرد کا ظہور ہوا جس نے لاذقیہ میں ۱۲۳۶ھ میں وفات پائی اس کے بعد نصیری فرقہ کے کئی سربراہ وپیشوا سامنے آتے ہیں جیسے شاعر قری محمد بن یونس کلازی (۱۱۱۳/۱۰۳۱/۱۶۰۲م) علی ماخوس، ناصر مصفی، یوسف عبیدی، سلیمان آفندی کلاذی کی [illegible] میں ہوئی، اس نے نصیری مذہب کی تعلیم

حاصل کی لیکن عیسائی مشنیری کے توسط سے وہ عیسائی ہوگیا اور بھاگ کے بیروت چلا گیا، وہاں اپنی کتاب الباکورۃ السلیمانیہ شائع کی۔ اس میں نصیری مذہب کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھایا۔ بعد میں نصیریوں نے مختلف ترغیبات سے دھوکا دیا، لیکن وہ واپس آیا تو اس کا گلا دبا کے اس کو موت کی ابدی نیند سلا دیا اور اس کی لاش کو لاذقیہ کے میدانوں میں نذر آتش کر دیا۔

تاریخی اعتبار سے یہ لوگ نصیری نام سے ہی معروف ہیں لیکن فرانس نے دولۃ العلویین کے نام سے ان کی ایک سلطنت قائم کی جو ۱۹۲۰ سے ۱۹۳۶ء تک برقرار رہی اس لئے وہ علوی مشہور ہوئے۔

محمد امین غالب الطویل۔ فرانس کے زیر انتداب ملک شام کا یہ نصیری قائد تھا اس نے ایک کتاب تاریخ العلویین کے نام سے لکھی، جس میں اس فرقہ کی اصل و اساس سے بحث کی ہے۔

سلیمان الاحمد۔ علوی حکومت میں دینی منصب کا حامل تھا۔ ۱۹۲۰ء سلیمان المرشد یہ چرواہا تھا، لیکن فرانسیسیوں نے اس کو اپنے پیار کی گود عطا کی اور دادو دہش سے اس کی پشت پناہی کی تو وہ ربوبیت والوہیت کا دعویدار بن گیا اور سلیمان المیدہ کو اپنا رسول نامزد کر دیا، سلیمان المیدہ بھی بکریوں کا چرواہا تھا استقلال حکومت نے ۱۹۴۶ء میں پھانسی دے کر اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مجیب الوہیت کا دعویدار بن کر اٹھا لیکن شامی جاسوسی کے وقت کے سربراہ کے ہاتھوں وہ قتل کیا گیا۔ آج بھی نصیریوں کا فرقہ مواخشہ اپنی قربانی پر ان کا نام لیتا ہے اور اسی کے نام سے قربانی پیش کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سلیمان المرشد کا دوسرا بیٹا الغیث بھی اپنے باپ کی الوہیت کا وارث بنا۔

افکار و عقائد: نصیری حضرت علیؓ کو الہ و معبود سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جس

طرح حضرت جبرئیل بعض انسانوں کی صورت دھار کر دنیا میں تشریف لاتے تھے اسی طرح حضرت علی کے جسد خاکی وفانی میں الہ روحانی دنیا میں جلوہ گر ہوا۔

عالم ناسوت میں الہ علی کا ظہور اس غرض سے ہوا کہ انسان کی الہ سے اجنبیت دور ہو اور یک گونہ انسیت پیدا ہو جائے۔

حضرت علی کے قاتل عبدالرحمٰن بن ملجم سے محبت و عقیدت رکھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اس نے حضرت علی کو قتل کر کے لاہوت کو ناسوت سے نجات دلا دی، اسی لئے جو لوگ حضرت علی کے قاتل کو سزاوار لعنت کہتے ہیں یہ لوگ ان کو غلط کار و خطا کار ٹھہراتے ہیں۔

بعض کا عقیدہ ہے کہ قید جسمانی سے آزاد ہونے کے بعد حضرت علیؓ نے چاند پر بود و باش اختیار کر لی اور بعض کہتے ہیں کہ چاند نہیں بلکہ سورج کو اپنا مسکن بنایا۔

ان کا عقیدہ ہے کہ علی نے محمد کو پیدا کیا اور محمد نے سلمان فارسی کو اور سلمان فارسی نے ان پانچ یتیموں کو پیدا کیا جن کے نام یہ ہیں۔

مقداد بن اسود۔ ان کو وہ انسانوں کا خالق و رب سمجھتے ہیں کہتے ہیں کہ رعد کے موکل ہیں۔

ابوذر غفاری۔ ستاروں کی گردش پر مامور ہیں۔

عبداللہ بن رواحہ۔ ہوا کی زمام ان کے ہاتھ میں ہے، انسانی روح کو قبض کرنے پر بھی مامور ہیں۔

عثمان بن مظعون۔ معدہ جسمانی حرارت، انسانی امراض کے موکل۔

قنبر بن کادان۔ اجسام میں روح پھونکنے کا کام ان کے ذمہ ہے۔

ابن نصیر نے تمام محرمات کو مباح قرار دیا ہے حتی کہ لواطت کو بھی جائز کہا ہے۔

دوسرے باطنی فرقوں کی طرح ان کے یہاں بھی ایک رات ایسی آتی ہے جس میں نفس کو بے مہار چھوڑ دیا جاتا ہے اور شرم و حیا، ادب و تمیز کو بالائے طاق رکھ کر

آزادانہ اختلاط کی رسم ادا ہوتی ہے ۔ شراب کی عظمت کے قائل ہیں، انگور کے درخت کو بھی باعظمت تصور کرتے ہیں اسی لئے اس کے کاٹنے اور اکھاڑنے کو معیوب سمجھتے ہیں کہ یہی شراب کی اصل و اساس ہے جس کو وہ نور کہتے ہیں ۔

پانچ وقت نماز ادا کرتے ہیں، لیکن ان کی نماز بے سجدہ کی ہوتی ہے، رکوع بھی برائے نام ہی ہوتا ہے رکعتوں کی تعداد بھی غیر منضبط ہوتی ہے ۔

جمعہ کی نماز کے وہ قائل نہیں ہیں، نماز سے پہلے رفع جنابت وضو و طہارت کا اہتمام بھی ضروری نہیں سمجھتے، وہ مسجدیں بھی نہیں بناتے، صرف گھروں میں نماز پڑھتے ہیں، نماز میں خرافات کی تلاوت کرتے ہیں ۔ فریضہ حج کا انکار کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ مکہ کا حج کفر ہے، بتوں کی پرستش ہے زکوٰۃ کے بھی منکر ہیں وہ صرف اپنے مشائخ کو ٹیکس کی صورت میں کچھ دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی زکوٰۃ ہے روزہ کی حقیقت ان کے نزدیک صرف اتنی ہے کہ رمضان بھر عورتوں سے اختلاط نہ کیا جائے ۔ صحابہ کرام سے بغض و عناد رکھتے ہیں، ابوبکر و عمر و عثمان پر لعنت کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ عقیدہ کے دو پہلو ہوتے ہیں، ایک ظاہری دوسرا باطنی اور وہی لوگ باطنی عقیدہ کے اسرار کے عالم اور دانائے راز ہیں اسی خیال کی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ :-

جنابت ۔ نام ہے اضداد کی دوستی اور باطنی علم سے ناواقفیت کا ۔

طہارت ۔ نام ہے اضداد کی دشمنی اور باطنی علم کی واقفیت کا ۔

روزہ ۔ عبارت ہے تیس مرد اور تیس عورتوں کے متعلق اسرار کی حفاظت سے

زکوٰۃ ۔ رمز ہے سلمان کی شخصیت کا

جہاد ۔ عبارت ہے دشمنوں کی لعنت کرنے سے اور راز کا افشا کرنے والوں کی لعنت سے

ولایت ۔ نصیریوں سے محبت و اخلاص کا نام ہے ۔

صلوٰۃ ۔ ان کے نزدیک ان پانچ ناموں سے عبارت ہے علی حسن حسین محسن و فاطمہ

محسن سر خفی ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ فاطمہ نے ان کو آغوش زمین کے حوالہ کر دیا تھا ۔

تمام علماء اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نصیری فرقہ مسلمان نہیں ہے اس لئے ان سے شادی بیاہ کرنا ان کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانا اور ان کی نماز جنازہ پڑھنا اور اسلامی سرحدوں کی نگہبانی پر ان کو متعین کرنا جائز نہیں ہے ۔ علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں ۔

نصیری فرقہ کے لوگ اور اسی طرح دوسرے باطنی فرقوں سے تعلق رکھنے والے قرامطہ وغیرہ، سب کے سب کافر ہیں بلکہ ان کا کفر یہود و نصاریٰ کے کفر سے بھی زیادہ سخت و شدید ہے دین و اسلام کے لئے ان کے نقصانات و خطرات تاتاریوں اور انگریزوں کے فتنوں سے زیادہ ضرر رساں ہیں، انہوں نے ہمیشہ اعداء اسلام کا ساتھ دیا ہے مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کی انہوں نے کھل کر مدد کی ۔ ان کے نزدیک سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ مسلمانوں کو تاتاریوں کے مقابلہ میں فتح نصیب ہوئی ۔ ان ہی کی مدد سے تاتاریوں نے خلیفہ بغداد اور دوسرے حکمرانوں کو تہ تیغ کیا، اور ان ہی کی مدد سے اسلامی ممالک میں تاتاریوں کو نفوذ حاصل ہوا ۔

تہوار ۔ ان کے متعدد تہوار ہیں ۔ یہ سارے تہوار ان کے عقیدہ و افکار کے سوتے سے نکلے ہیں ۔

۱ ۔ عید نوروز ۔ جولائی کی ۴ تاریخ کو یہ تہوار منایا جاتا ہے ۔ یہ ایرانیوں کے سال کا پہلا دن ہوتا ہے ۔

۲ ۔ عید غدیر ۔ محرم کی دس تاریخ کو کربلا میں حضرت حسینؓ کی شہادت کی یاد کے طور پر مناتے ہیں ۔

۳ ۔ یوم المباہلہ اور یوم الکساء ۔ ربیع الاول کی نو تاریخ کو یہ تہوار منایا جاتا ہے نجران کے عیسائیوں کو نبی اکرمؐ نے مباہلہ کی جو دعوت دی تھی، اسی کی یاد کے طور پر یہ تہوار منایا جاتا ہے ۔

۴ ۔ عید الاضحیٰ ۔ ذی الحجہ کی ۱۰ تاریخ کو منایا جاتا ہے ۔

۵- عیسائیوں کی مختلف عیدوں کو یہ لوگ بھی اپنی عید کے طور پر مناتے ہیں۔

۶- مثلاً عید غطاس۔ عید عنصرہ۔ عید قداس بربارہ۔ عید میلاد، عید صلیب اسی عید صلیب سے وہ اپنی زراعت اور تجارت وغیرہ کے دوسرے کام شروع کرتے ہیں

۶- یوم دلام ۔ ربیع الاول کی ۹ تاریخ کو یہ تیوہار مناتے ہیں دراصل اس تیوہار کے ذریعہ وہ حضرت عمرؓ کے قتل کی خوشی مناتے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔

فکری اور عقائدی سوتے

قدیم بت پرستانہ تہذیب سے ان کے عقائد کا رشتہ جوڑا، ستاروں کو مقدس ہستی تصور کیا اور ستاروں کی آغوش کو ہی حضرت علی کا مسکن و مستقر خیال کیا۔

جدید افلاطونی افکار سے متاثر ہو کر اشیاء پر نورانی فیض کا نظریہ وضع کیا۔

فلاسفہ کے مذاہب کے مطابق اپنے عقائد کی تشکیل کی۔ عیسائیوں سے تثلیث کا عقیدہ لیا اور شراب کو مباح گردانا تناسخ اور حلول جیسے ہندوستانی عقائد کو بھی اپنایا۔

یہ لوگ غلو پسند شیعہ ہیں ان کے عقائد و افکار پر شیعی عقائد کی پوری چھاپ ہے بلکہ ان کے عقائد بھی وہی ہیں جو عموماً شیعوں اور سبائیوں کے عقائد ہوتے ہیں

نصیریوں کے علاقے

لاذقیہ میں نصیریہ کے پہاڑی علاقوں میں ان کی آبادیاں ہیں۔ آخیر میں یہ شام کے بڑے بڑے شہر میں بھی آباد ہو گئے۔ اناضول کے مغربی علاقوں میں بھی ان کی اچھی تعداد ہے وہاں یہ لوگ تختجیہ اور حطاون کے نام سے معروف ہیں جبکہ مشرقی اناضول میں قزلباشی کہے جاتے ہیں ترکی اور جاپان کے بعض علاقوں میں بکتاشیہ کے نام سے جانے جاتے ہیں ان کی معتد بہ تعداد ایران اور ترکستان میں بھی پائی جاتی ہے جہاں ان کی کچھ تعداد لبنان و فلسطین میں بھی پائی جاتی ہے۔

علامہ محمود شاکرؒ کا سانحہ ارتحال

عبدالکریم انور حکیمی

مشہور لغوی و ادیب علامہ محمود شاکر رحمۃ اللہ علیہ سات اگست بروز جمعرات ۸۸ سال کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ نے قاہرہ میں ۹ محرم ۱۳۲۷ھ کو ایک علمی خاندان میں آنکھیں کھولی تھیں۔ آپ کے والد محترم شیخ محمد شاکر احمد عبدالقادر سوڈان میں چیف جسٹس کے عہدہ پر فائز تھے اور آپ کے بھائی شیخ احمد شاکر ایک زبردست محقق تھے۔ آپ نے "الرسالہ" اور مسند احمد کی شرح لکھی ہے البتہ مسند کی شرح کو پایۂ تکمیل تک نہ پہونچا سکے اور آپ کے ایک دوسرے بھائی شیخ علی بھی قاضی تھے

آپ نے جامعہ فواد کے شعبہ لغت سے بی۔ اے شروع کیا لیکن تکمیل نہ کر سکے کیوں کہ دوران تعلیم جاہلی شاعری کے سلسلے میں آپ نے اپنے استاذ طہ حسین کی رائے پر تنقید کرنی شروع کر دی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں آپ کی ادارت میں ایک مجلہ "العصور" کے نام سے شائع ہونا شروع ہوا جس کے دو ہی شمارے منظر عام پر آ سکے۔

۱۹۵۹ء میں آپ اسلام کیلئے جذبہ جہاد رکھنے کی وجہ سے گرفتار کر لئے گئے اور ۱۹۶۵ء میں دوبارہ آپ کی گرفتاری ہوئی جس سے رہائی ۱۹۶۶ء میں ملی۔ ۱۹۸۰ء میں آپ کو "مجمع اللغۃ العربیۃ دمشق" کا ممبر منتخب کیا گیا تین ہی سال بعد قاہرہ کی اکیڈمی آف عربی زبان و ادب نے بھی آپ کو اپنا ممبر منتخب کر لیا۔ ۱۹۸۳ء میں عربی زبان و ادب پر آپ کی بے نظیر خدمات کی بنا پر فیصل ایوارڈ سے نوازا گیا۔

آپ متعدد کتابوں کے محقق اور مؤلف ہیں آپ کی تحقیق سے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں مندرج ذیل کافی مشہور ہیں۔

۱۔ فضل العطاء علی العسر ۲۔ طبقات فحول الشعراء ۳۔ امتاع الاسماع

"جمع لانسب قریش واخیار هاشم ... المکانة وحسن التقلی"

عربی زبان وادب کے تعلق سے آپ کی خدمات آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔ آپ کی عربی زبان وادب پر متعدد مفید اور گراں قدر کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن میں درج ذیل کتابیں زیادہ مقبول ہیں ۱۔ اباطیل واسمار ۲۔ ابو الطیب المتنبی۔ ۳۔ رسالۃ فی الطریق الی ثقافتنا ۴۔ نمط صعب و نمط مخیف۔

شعر گوئی پر آپ کو مکمل قدرت حاصل تھی آپ کے کلام کے دو مجموعے "القوس العذراء" اور "طلمۃ طویلۃ" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں عربی زبان وادب کے تعلق سے مستشرقین کے شکوک وشبہات کے ازالہ کی کوشش آپ تاحیات کرتے رہے۔ شروع میں جاہلی شاعری کے متعلق طہ حسین سے اور پھر "ابو العلاء المعری" کے سلسلے میں ڈاکٹر اویس عوض سے آپ کی ادبی جنگ جاری رہی۔ عامی زبان کے انتشار اور عربی کے لاطینی حروف میں منتقل کی رائے کے آپ شدید مخالف تھے۔ اس سلسلے میں آپ کا یہ احساس تھا کہ دراصل لاطینی حروف میں انتقال کے ذریعہ اہل مغرب مسلمانوں کے اس لسانی رشتہ کو کمزور کرنا چاہ رہے ہیں جو تمام مسلمانان عالم کے درمیان پایا جاتا ہے اور اس سلسلے میں آپ کی تحریریں و تقریریں شاعر نیل، حافظ ابراہیم کے اس شعر کی عکاسی کرتی ہیں کہ

انا البحر فی احشائہ الدر کامن   فھل ساءلوا الغواص عن صدفاتی

آہ سید یوسف مرحوم

آہ سید یوسف مرحوم! کسے معلوم تھا کہ ۳۰ ستمبر ۱۹۹۶ء ان کے لئے پیام اجل بن کر آئے گی۔ دفتر حلقہ لکھنؤ سے خبر ملی یقین نہیں آیا دہلی سے ربط قائم کیا خبر کی تصدیق ہو گئی، تفصیل معلوم ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میں جب بھی دہلی گیا مرکز پہونچا سید مرحوم سے ملاقات ہوئی، بڑی گرمجوشی سے ملے ہر ایک کی نام بنام خیریت معلوم کی، پروگرام پوچھا اور یہ ضرور کہا کہ آج دوپہر یا شام کو ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔ بہت محبت سے بلاتے اور پیار سے کھانا کھلاتے اور ڈھیر ساری دعائیں دیتے۔

مسائل سننے اور غور سے سنتے ہر وقت مشغول رہنے کے باوجود وقت نکالتے دلچسپی لیتے اور حل بتاتے۔ دین سے لگاؤ اور اس کی تبلیغ کا جذبہ حرف زبانی جمع خرچ نہیں [illegible] فلاح یافتہ مہذب اور سنجیدہ باپ ہی کی طرح ملنسار اور [illegible] تابعدار، اگر یہ کسی چیز کی دلیل ہے تو باپ کا بیٹے کی تعلیم و تربیت [illegible] کی۔ اللہ تعالیٰ اولاد صالح کو والد صالح کے لئے دعائے صالح کی توفیق دے۔

جامعہ سے خاص تعلق تھا، میں اس بارے میں ان سے ملتا کھل کر باتیں کرتا میں تو بہت سی باتیں کر کے بھول جاتا وہ یاد رکھتے اور خط لکھ کر فون کر کے فیکس کے ذریعہ مسائل حل کرنے میں لگ جاتے قطر کا پہلا سفر ان کی خاص کوششوں کا ثمرہ تھا سید شاہ یعقوب ان کے برادر عزیز سے تعارف اور ان کا فعال تعاون ان ہی کا مرہون منت تھا۔

انجمن طلبہ قدیم کا ذکر ہوتا مسائل ان کے سامنے آتے اور انہوں نے اس میں بھی ہمیشہ سرگرم تعاون کیا ایک بار دہلی میں انجمن کی برانچ آفس کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ ابو الفضل میں

بقیہ ص ۔۔ پر

ادارہ

جامعہ کے لیل ونہار

جامعۃ الفلاح سوگوار ہے

سکریٹری جماعت اسلامی ہند، ایڈیٹر ہفتہ وار انگلش ریڈینس، جناب سید یوسف صاحب کے انتقال پر ملال پر ۲ر اکتوبر ۱۹۹۶ء بروز جمعرات ابواللیث ہال میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ صدر جامعہ جناب مولانا طاہر مدنی نے اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے موصوف کی زندگی کے سبق آموز پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ موصوف کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں تحریر وتقریر کا یکساں ملکہ حاصل تھا۔ انگریزی اخبارات اسلام کے خلاف جو شکوک وشبہات پھیلاتے ریڈینس میں مرحوم ان کا تفصیلی جواب دیا کرتے۔ ان کے ادارتی تحریر کی کوششیں ریڈینس کے صفحات کا مابہ الامتیاز تھا چونکہ ان کی تحریریں بہت وقیع ہوا کرتی تھیں اس لئے ان کا ترجمہ سہ روزہ دعوت میں بھی شائع ہوتا رہتا تھا۔

آپ کے بعد جناب مولانا نعیم الدین صاحب اصلاحی نے پُرسوز ودرد بھرے انداز کے ذریعہ دلوں کو غم کی آنچ دکھائی۔ آپ نے مرحوم کی وفات پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ مرحوم کی موت ایک فرد کی نہیں بلکہ "موت العالِم موت العالَم" کا مصداق تھی کیونکہ ایک ارب آبادی والے ملک ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً پچیس کروڑ ہے اور ان میں جماعت اسلامی کے ارکان کی تعداد صرف چار ہزار ہے اور ان میں ایسے لوگ تو خال خال ہی نظر آئیں گے جنہیں انگریزی زبان پر بھی مکمل عبور حاصل ہو۔

مولانا نے بتلایا کہ مرحوم سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ ان کی اور ان کے اہل وعیال کی زندگی کا انہوں نے بڑے ہی قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ موصوف نہایت ہی ملنسار تھے۔ مہمان نوازی کی صفت آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آپ کی دینداری اور

قرآن واسلام سے آپ کے لگاؤ وشغف کا اندازہ کچھ اس بات سے بھی ہو سکے گا کہ [illegible] آپ کی تمام بچیاں اور بچے حافظ قرآن ہیں۔ آپ کی تعلیم مغربی ماحول میں ہوئی لیکن اپنی ذاتی محنت ومشقت اور سعی وجہد کے ذریعہ آپ اس بلند مقام پر فائز ہو گئے کہ اسلامی موضوعات پر آپ کی عالمانہ وفاضلانہ تحقیقات کو علمی حلقوں میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ آپ کی زندگی کا یہ روشن باب ہمیں جد وجہد اور حرکت وسرگرمی کی دعوت دیتا ہے کہ زندگی کی ترقی وکامرانی کا راز اسی میں مضمر ہے۔

آخر میں اساتذہ جامعہ، منتظمین اور طلبہ کی جانب سے ایک قرارداد پاس کی گئی جس کا متن درج ذیل ہے۔

سکریٹری جماعت اسلامی ہند جناب سید یوسف صاحب کے انتقال کی خبر جامعۃ الفلاح کے جملہ وابستگان کے لئے [illegible] موصوف جماعت اسلامی ہند کے اہم رہنماؤں میں سے تھے [illegible] اور انگریزی ترجمان "ریڈینس" کے چیف ایڈیٹر تھے کئی برسوں سے [illegible] خدمات انجام دے رہے تھے۔ مرحوم کو جامعۃ الفلاح سے بڑا تعلق خاطر تھا [illegible] کے یہاں سے فارغ ہیں۔ کئی بار یہاں تشریف لائے اور خطاب فرمایا اور جامعہ کی ترقی کے لئے برابر عملی کوشش کرتے رہے تھے۔ ان کی وفات سے ایک خلا پیدا ہو گیا۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کی خدمات کو قبول فرمائے۔ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے، پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے اور ان کی وفات سے تحریک میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کی تلافی کی شکل پیدا کرے۔ اس موقع پر اساتذہ، منتظمین اور جامعہ کے طلبہ مرحوم کے اہل خاندان سے گہری ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے غم میں پورے طور سے شریک ہیں۔

طلبہ کا تعلیمی مظاہرہ

جمعیۃ الطلبہ ہر سال اپنا تعلیمی مظاہرہ کرتی ہے۔ اساتذہ کرام اور منتظمین جامعہ تحریر وتقریر کے میدان میں طلبہ کی پیش رفت

اور پیش قدمی کا اندازہ اسی مظاہرہ سے لگا کر ان کے اندر موجود خامیوں کی نشاندہی کرتے ہیں جس سے انکی صلاحیتوں کو جلا ملتی ہے اور وہ مزید نکھرتی و سنورتی چلی جاتی ہیں۔ امسال یہ تعلیمی مظاہرہ ۲۳، ۲۵ر اکتوبر ۱۹۹۶ء کو ابواللیث ہال میں منعقد ہوا جس میں تمام ہی شعبہ جات کے طلبہ نے اردو، عربی، انگریزی، کشمیری اور آسامی زبان میں تقریریں کیں۔ ترانے، نظمیں، اور بعض تمثیلچے بھی پیش کئے گئے۔ طلبہ نے اپنی تقریروں کے ذریعہ سامعین کے دلوں میں فریضہ اقامت دین اور شہادت حق کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کا شدید جذبہ پیدا کیا۔

پورے تعلیمی مظاہرے کے دوران ہال میں سکون و وقار اور سنجیدگی کا دور دورہ رہا۔ البتہ چھوٹے بچوں کی مسلسل آمد و رفت سے یہ سکون ٹوٹتا بھی رہا۔

تقسیم انعامات بچوں کے اندر تعلیمی شوق و جذبہ پیدا کرنے اور تعلیمی میدان میں باہم مسابقت و منافست کا حوصلہ پیدا کرنے کے لئے انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح اپنے یوم تاسیس سے ہی ممتاز طلبہ کو تشجیعی انعامات سے نوازتی رہی ہے۔ اور بعض مجبوریوں کی بنا پر کئی سالوں کے انعامات تقسیم نہ ہو سکے تھے امسال تعلیمی مظاہرہ کے موقعہ پر ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۷-۹۶ء تک کے ممتاز طلبہ کے انعامات جناب مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی کے متبرک ہاتھوں کے ذریعہ مفید و اصلاحی کتابوں کی شکل میں تقسیم کئے گئے۔ تقسیم انعامات کے ذمہ دار جناب مولانا اظہار احمد فلاحی نے بتایا کہ یہ انعامات دس ہزار کی قیمت کے تھے۔

دعائے مغفرت یہ خبر متعلقین جامعہ کے لئے بڑی ہی المناک و دردناک ہے کہ محترم ابوالنصر صاحب فلاحی کے والد محترم جناب حکیم عبدالرحمٰن صاحب کی مختصر علالت کے بعد ۲۵ر اکتوبر ۱۹۹۶ء کو ان کے آبائی وطن کوئیلا ڈیہ بزرگ میں انتقال ہو گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ادارہ موصوف کے اس غم میں برابر کا شریک ہے۔ اور خدائے بزرگ و برتر

بقیہ صفحہ 15 پر